ارتکازِ نظر



لیاقت علی

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

نام : لیاقت علی

وا کانام : عبدالحفیظ

وا ہ : زلیخاں بیگم

تاریخ ولادت: 03 اپریل، 1987

جائے پیدائش: کیری برہوی، تحصیل کاکوٹ،
ضلع راجوری، جموں وکشمیر۔

تعلیم: ایم۔اے۔(اردو)JNU
ماس میڈیا(ڈپلوما)JNU
ایم۔فل۔(اردو)JNU
پی ایچ ڈی(اردو)
جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی (جاری)

تصنیفات: ارتکاز نظر
جموں وکشمیر میں اردو ادب (۲۰۰۰ تا ۲۰۱۳ء)
جموں وکشمیر میں اردو زبان اور دیگر علاقائی زبانیں (زیر طبع)
1980 کے بعد جموں وکشمیر کے نمائندہ اردو افسانے (زیر طبع)

رابطہ نمبر : 9968864710
iaqat.ali393@gmail.com

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

بصد خلوص و احترام
استاد سلیم سالک کی خدمت میں

[illegible]
[illegible]

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

ارتکاز نظر

لیاقت علی

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

کتاب : ارتکاز نظر
مصنف : لیاقت علی
مطبع : ایچ ایس آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی۔
ناشر : ایم۔آر۔پبلی کیشنز
10 میٹروپول مارکیٹ، 25-2724 کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی

IRTEKAZ-E-NAZAR

BY

Liaqat Ali

Email: liaqat.ali393@gmail.com

ISBN: 978-93-86125-45-3

First Edition :2016

Price: ₹ **200/-**

Library Edition: ₹ 300/-

Printed & Published by

M. R. Publications

Printers, Publishers, Book Sellers & Distributors of Literary Books

10 Metropole Market, 2724-25 First Floor

Kucha Chelan, Daryaganj, New Delhi-110002

Cell: 09810784549, 09873156910 E-mail: abdus26@hotmail.com

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

انتساب!

والدین

اور

استادگرامی پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین

کے نام

جن کے دست شفقت و محبت نے مجھے اس مقام تک پہنچنے کا حوصلہ دیا

اور جن کی دعائیں

ہر اک منزل زیست پر

میرے سر پر ہیں سایہ فگن

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

مضامین کا آئینہ

حرف آغاز 7

مقدمہ ڈاکٹر نسیم احمد نسیم 9

ا۔ سائنٹفک تحقیق کے مسائل اور طریقہ کار 13

2۔ اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کے ابتدائی نقوش 36

3۔ اردو اور گوجری زبان کا لسانی تقابل 48

4۔ جموں وکشمیر میں اردو زبان کے ابتدائی نقوش 60

5۔ جموں وکشمیر میں اردو افسانوں کے تخلیقی رویئے 72

6۔ اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں جموں وکشمیر کی اردو شاعرات 87

7۔ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کے ادبی کارنامے 103

8۔ عورت کا استحصال اور عصمت چغتائی 113

9۔ خواجہ میر دردؔ کی شاعری میں متصوفانہ افکار 124

10۔ ڈاکٹر سید عبدالباری اردو ادب کے مزاج شناس 145

11۔ اختر مدھو پوری ایک قادر الکلام شاعر 161

12۔ ہندوستان میں مغلیہ فن تعمیر 171

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

حرف آغاز

ارتکاز نظر میرے تنقیدی و تحقیقی مضامین کا پہلا مجموعہ ہے۔ یہ مضامین گذشتہ تین چار برس میں لکھے گئے تھے۔ مشمولات پر نگاہ ڈالتے ہی اندازہ ہوسکتا ہے کہ یہ مختلف موضوعات پر مبنی مضامین میری دلچسپی کا مرکز رہے ہیں۔ سائنٹفک تحقیق کے مسائل اور طریقہ کار، ترقی پسندی کے ابتدائی نقوش، اردو اور گوجری زبان کا لسانی تقابل، جموں و کشمیر میں اردو ادب کے ابتدائی نقوش، جموں و کشمیر میں اردو افسانوں کے تخلیقی رویئے، جموں و کشمیر کی اردو شاعرات، عورت کا استحصال اور عصمت چغتائی، میر درؔد، سید عبدالباری، اختر مدھوپوری اور پھر ہندوستان میں مغلیہ فن تعمیر، ان سب پر یہاں اظہار خیال موجود ہے۔ عالمی تاریخی وتہذیبی تناظرات میں اور علمی وفکری روایت کے تناظر میں مربوط مطالعہ کرنے کی طالب علمانہ کاوش کی گئی ہے۔ میرے لئے یہ خوشی کا باعث ہے کہ وہ کام جس سے میں گذشتہ تین چار برس سے وابستہ ہوں، ایک ذہنی اور تخلیقی صورت اور واضح شکل میں سامنے آرہا ہے۔ مشمولات سے عیاں ہے کہ مختلف موضوعات پر لکھنا بحیثیت طالب علم ایک مشکل کن امر تھا لیکن جیسے جیسے اس کام سے میرا ذہنی انسلاک بڑھتا گیا اس کام میں دلچسپی پیدا ہوتی گئی۔ اس مجموعے میں مضمون سائنٹفک تحقیق کے مسائل اور طریقہ کار اپنی نوعیت کا

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

ایک منفرد اور اہم مضمون ہے۔ اس میں تحقیق اور اصول تحقیق کے حوالے سے بحث کی گئی ہے۔ تحقیق کے لغوی اور اصلاحی مفاہیم کے ساتھ ساتھ سائنٹفک تحقیق کے بنیادی اور ضروری نکات شامل ہیں۔ تمام مضامین اپنے موضوع کی نوعیت سے اور ماہیت کے اعتبار سے منفرد ہیں اور اپنے اختصار کے باوجود بہت اہم مواد کے حامل ہیں۔ ان میں کچھ ایسے ضروری نکات بھی شامل ہیں جس پر باقاعدہ تحقیقی کتابوں کی بنیاد استوار کی جاسکتی ہے۔ تنقید و تحقیق میں کبھی تکمیل کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا۔ سردست اس مجموعے سے مجھے یہ خوشی ہے کہ اردو کے تحقیقی تناظر میں کئے جانے والے کام میں میری یہ حقیر سی کوشش بھی ایک اولین پیش رفت کی حیثیت سے یاد رکھی جائے گی۔

اس مجموعے کا عنوان ڈاکٹر حقانی القاسمی نے تجویز کیا اور کئی اہم نکات کی افہام و تفہیم کے سلسلے میں مجھے بہت وقت دیا۔ ہمیشہ مجھ سے خندہ پیشانی سے ملتے رہے اور تعاون کرتے رہے، ان کا میں شکر گذار ہوں۔ ادھر اُدھر بکھرے مضامین کا جمع ہوسکنا نگراں شفق و مکرم استاد پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین کے مسلسل فیض ظاہری و معنوی اور دلنواز، متاثر کن علمیت و ذہانت کے طفیل ممکن ہوا ہے جس کے لئے تشکر کے بے پایاں جذبات رسمی الفاظ میں نہیں سموئے جاسکتے۔ پروفیسر شہاب عنایت ملک ایک استاد کی حیثیت رکھتے ہیں جن کی خندہ رُو حوصلہ افزائی، عالمانہ و محبانہ اعانت و رہنمائی قابل صد افتخار ہے، میں ان کا ممنون ہوں۔ ڈاکٹر نسیم احمد نسیم جو ادبی سرگرمیوں میں مصروف کار رہتے ہیں۔ میرے ان مضامین کا باریک بینی اور دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کر کے مقدمہ تحریر کیا۔ ان کا میں شکر گذار ہوں۔ اس سارے کام کی رہنمائی مہربان دوست خان رضوان نے برادرانہ اعانت، اپنی شگفتہ طبعی و بے ریائی کے باعث کی، جس کے لئے میں خوش ہوں کہ مجھے ان کی قربت نصیب ہوئی۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

مقدمہ

ڈاکٹر نسیم احمد نسیم

''ارتکاز نظر'' لیاقت علی کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ مضامین مختلف موضوعات پر مختلف وقتوں میں تحریر کئے گئے ہیں۔ کتاب میں شامل لیاقت علی کے مضامین پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک ذمہ دار ناقد اور محقق کی طرح اپنے موضوع کے سیاق وسباق سے پوری طرح واقفیت حاصل کرنے اور پھر گہرے مطالعے کے مرحلے سے گزرنے کے بعد ہی کوئی موقف یا رائے قائم کرتے ہیں۔ اکثر مضامین میں ان کا انداز معروضی اور مدلل ہے۔ وہ تاریخی ماخذات اور منابع سے بھرپور طریقے سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے دلائل کو مستحکم شکل دیتے ہیں۔ فنکاروں اور فن پاروں کے تجزیے اور جائزے کے دوران وہ حد درجہ محتاط روی سے کام لیتے ہیں۔ یہ خصوصیت انھیں اکثر لکھنے والوں سے ممتاز کرتی ہے۔

یہ کتاب گرچہ لیاقت علی کے یہاں نقشِ اول کی حیثیت رکھتی ہے لیکن ادب کی مختلف اصناف پر ان کی گہری نظر، ان کے تجزیاتی انداز اور شوق مطالعہ کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ وہ اردو تنقید و تحقیق کے نئے منظر نامے پر اپنی واضح شبیہ ابھارنے میں کامیاب ہوں گے۔

مجموعہ مضامین ''ارتکاز نظر'' ایک درجن مضامین پر مبنی ایک قابل قدر تصنیف ہے۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

جناب لیاقت کا تعلق چونکہ جموں و کشمیر سے ہے اس لئے انھوں نے اپنے خطے کا حق ادا کرتے ہوئے وہاں کی ادبی خدمات اور لسانی امتیازات کو بہت ہی عمدہ طریقے سے اجاگر کیا ہے۔ ''جموں و کشمیر میں اردو زبان کے ابتدائی نقوش'' ان کا ایک خالص تحقیقی نوعیت کا مضمون ہے۔ اس کے غائر مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ صاحب کتاب نے کس قدر تحقیقی جگر کاوی سے کام لیا ہے اور جموں و کشمیر میں اردو کے ابتدائی نقوش کی دریافت کے دوران کتنے منابع، مراجع اور مصادر تک رسائی حاصل کی ہے۔ انھوں نے اس مضمون میں تاریخی حوالوں سے کام لیتے ہوئے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جن دنوں کشمیری راجاؤں کی آپسی لڑائیاں اور چپقلش شباب پر تھیں، انھی دنوں (یعنی 1336ء میں) کشمیری عوام کی صحیح سمت میں راہنمائی کے لئے ترکستان کے معروف صوفی سید اشرف الدین عبدالرحمٰن بلبل کا اپنے مریدوں اور عقیدت مندوں کے ساتھ کشمیر میں ورودِ مسعود ہوا۔ آگے چل کر ماحول سازگار ہوئے تو وہاں کے حکمراں رفتہ رفتہ فارسی زبان سے قریب ہونے لگے اور اس کا سلسلہ اس قدر دراز ہوا کہ کشمیر زبانِ فارسی کا ایک اہم مرکز بن گیا۔ عبدالقادر سروری نے اپنی کتاب ''کشمیر میں اردو'' میں اہل ایران کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہ کشمیر کو ''ایرانِ صغیر'' کہتے تھے۔

مصنف کے مطابق کشمیر میں مغلوں کی آمد نے اردو زبان کے ارتقا اور ترقی و ترویج میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اور بعد کے زمانے میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے قائم مقام مہاراجہ گلاب سنگھ نے اپنی وسعت ذہنی (یا مصلحت پسندی) کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے دربار میں مختلف علوم کے ماہرین کے ساتھ اردو داں عملہ کو بھی رکھا اور جب کشمیر کا رابطہ لاہور کے شعراء ادباء کے ساتھ ہوا تو پھر اس انسلاک نے کشمیر میں اردو کے گل بوٹے کھلانے شروع کردیئے اور کشمیر میں تیزی کے ساتھ اردو زبان و ادب کا فروغ ہونے لگا۔

اس مضمون میں ادبی خدمات کے ساتھ مصنف نے کشمیر میں اردو کی صحافتی خدمات کا بھی بھرپور جائزہ پیش کیا ہے اور مختلف اخبارات و رسائل کے حوالے پیش کئے ہیں۔ یہ

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

مضمون بہت عرق ریزی سے لکھا گیا ہے اور کشمیر میں اردو کے آغاز وارتقاء پر مختصر لیکن بہت ہی جامع اور معلوماتی مضمون ہے۔

''اردو اور گوجری زبان کا لسانی رشتہ'' بھی ایک بہت ہی اہم اور چشم کشا مضمون ہے۔ گوجری ایک بہت ہی پرانی زبان ہے اور اس کے بولنے والوں کا سلسلہ نہ صرف وسط ایشائی ممالک بلکہ شمالی اور جنوبی یورپ تک پھیلا ہوا ہے۔ اس مضمون میں گوجر قوم کے احوال بھی بہت تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ اس زبان کا اثر گجراتی زبان پر بھی واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ اس مضمون کی بڑی اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ اردو سے اس کا رشتہ قائم کرنے کے دوران ٹھوس حوالے، دلائل اور مثالیں پیش کئے گئے ہیں۔

''اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کے ابتدائی نقوش'' میں بھی مصنف نے ایسا ہی طریقہ رائج رکھا ہے کہ تحریک کے آغاز کے اولین نقوش واضح ہو جائیں۔ اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی اور علی سردار جعفری نے بہت تفصیل سے اس کے آغاز اور اغراض و مقاصد کی بابت اظہار خیال کیا ہے۔ اس میں مصنف کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اختصار کے ساتھ بہت اچھے اسلوب میں تحریک کے ابتدائی احوال، سرگرمیوں اور مرحلوں کو پیش کیا ہے۔

اس کتاب میں شاعری کے حوالے سے تین مضامین ''اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں جموں وکشمیر کی شاعرات''، ''خواجہ میر دردؔ کی شاعری میں تصوفانہ افکار''، ''اختر مدھوپوری: ایک قادر الکلام شاعر'' شامل ہیں۔ مصنف نے یہاں بھی تحقیقی اور تجزیاتی طرز کو اپنایا ہے اور شعراء وشاعرات کے مزاج وآہنگ اور موضوعات واسلوب کی تفہیم میں اپنی شعر فہمی کا ثبوت دیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس مضمون کے ذریعے مذکورہ بالا شعراء اور شاعرات کی شاعرانہ خصوصیات واضح طور پر ابھر کر سامنے آجاتی ہیں۔

اس کتاب کے دوسرے مضامین میں ''جموں وکشمیر میں اردو افسانوں کے تخلیقی

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

رویے''، ڈاکٹر مشتاق احمد دانی کے ادبی کارنامے''، ''ڈاکٹر سید عبدالباری: اردو ادب کے مزاج شناس'' اور ''ہندوستان میں مغلیہ فنِ تعمیر'' بھی شامل ہیں۔ اور یہ سارے کے سارے مضامین حد درجہ اہمیت کے حامل ہیں۔

کتاب کا سب سے پہلا مضمون ایک لحاظ سے سب سے زیادہ اہم مضمون ہے۔ یہ جامعات کے طلباء و طالبات کے لئے ایک مشعل راہ ہے۔ اس میں مختلف حوالے اور امثال کے ذریعے مصنف نے تحقیق کی باریکیوں کے متعلق بات کی ہے۔ اصول تحقیق اور مسائل تحقیق پر بہت ہی محنت سے لکھے گئے اس مضمون کو اس کتاب کا مغز کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ وہ، اس لئے کہ آج تحقیق کا ماحول بہت ہی غیر معیاری، ناپختہ اور پراگندہ ہو چکا ہے۔ اصول تحقیق یا Research Methodology سے بہت کم مطلب رکھا جاتا ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تحقیق کی سمت ہی نہیں بدلتی اس کا نصب العین بھی بدل جاتا ہے۔ لہٰذا یہ مضمون ایک بڑی کمی اور خامی کو دور کرنے کے باب میں عمدہ کوشش ہے جس کے لئے مصنف کو داد دینی چاہیے۔

لیاقت علی ایک ذہین اور محنتی قلم کار ہیں۔ ان کے یہاں تنقید و تحقیق سے گہرا شغف ہے اور کہا جاتا ہے کہ ابتدا میں جس ناقد یا محقق کو تلاش و جستجو اور حقائق کی صحیح عکاسی کی خو پڑ جائے تو وہ آئندہ کا بڑا قلم کار ثابت ہوتا ہے۔ مجھے لیاقت علی میں کچھ ایسا ہی جھلکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

امید ہے مجموعہ مضامین ''ارتکازنظر'' ادب کے جانکاروں اور فنکاروں کے درمیان سنجیدگی اور پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے گا اور اس کی ہر سطح پر پذیرائی ہوگی۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

سائنٹفک تحقیق کے مسائل اور طریقہ کار

انسان کو رب العزت نے عقل و شعور جیسی نعمت سے فیضاب کیا ہے جس کی بدولت ہر نئی چیز کی دریافت اور کھوج کے شیدائی مطلوبہ معلومات دنیا کے سامنے رکھتے ہیں۔ نوعِ انسانی تاریخ ہی سے یہ عمل رائج رہا ہے خواہ وہ کوئی بھی قوم ہو، کوئی بھی تہذیب ہو، کوئی بھی مذہب ہو یا پھر کوئی بھی معاشرہ اس پر خار تحقیقی راستے سے گذرے ہیں۔ ''پانچ حروف پر مشتمل یہ لفظ باب تفعیل کا مصدر ہے جس کا مادہ، ق ق ہے لغت میں اس کے معنی تلاش، جستجو، کھوج، تفتیش، دریافت اور چھان بین کے ہیں'' تحقیق کی بہت ساری تعریفات کی گئی ہیں جن میں صرف لفظوں کا رد و بدل ہے تاہم مفہوم اور اصل سب قریب قریب ہی ہے۔ چند تعریفات درج ذیل پیش ہیں۔

1۔ عندلیب شادانی:

''تحقیق یعنی ریسرچ کا مطلب یہ ہے، یا تو نئے حقائق دریافت کئے جائیں یا پھر مطلوبہ حقائق کی کوئی ایسی نئی تعبیر پیش کی جائے کہ اس سے ہماری معلومات میں معتدبہ اضافہ جائے۔''[1]

2۔ قاضی عبدالودود

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

''تحقیق کسی امر کو اس کی اصل شکل میں دیکھنے کی کوشش ہے۔''۲

3۔ جمیل جالبی

''تحقیق دراصل تلاش وجستجو کے ذریعے حقائق معلوم کرنے اور ان کے تصدیق کرنے کا نام ہے۔''۳

4 : Accordnig to dictionary of English Oxford:

A." To search into matter of subject to investigate of study closely "

B." To search again and repeatedly"4

5 : According to the oxford reference Dictionary:

"Accornding to the investigate into and study of materials and sources in order to new conclusion."5establish facts and reach

مذکورہ بالا تعریفات کی روشنی میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ تحقیق کسی شے یا علم کے ''حقیقت'' کا اثبات اور موجود مواد کے صحیح یا غلط کو بعض مسلمات کی روشنی میں دیکھنا ہے۔ عہد جدید سائنسی دور ہے، ایسے دور میں کوئی بھی نئی دریافت جو سائنس کی کسوٹی پر مبنی نہ ہو غیر مستند ٹھرائی جاتی ہے۔ اگر ماضی کی تاریخ کو دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ انسانی تاریخ کی ساری ترقی اور کامیابی تحقیق کی مرہونِ منت رہی ہے اس کے بغیر کسی ملک یا کسی قوم نے ترقی نہیں کی۔ آج سائنس نے زندگی کے ہر شعبے پر گہرے اثرات مرتب کئے ہیں اور ہر نئی صبح نت نئی ایجاد سامنے آتی ہیں ان میں بعض ایسی ایجادات ہوتی ہیں جن کے ادراک سے عقل دنگ رہ جاتی اور اس کی صداقت پر آسانی سے یقین نہیں آتا۔ مثلاً اسپین میں باسک سینٹر برائے دماغ، زبان اور ذہنی صلاحیت کے ماہر بلیئر آرمسٹر نے ذہنی سوچ سے کمپوٹر کھولنے اور لاگ ان کرنے کا کامیاب تجربہ کیا ہے۔ یقیناً یہ حیرت انگیز پیش رفت ہے۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

اگر علمی وادبی دنیا میں ''سائنٹفک تحقیق'' کی بات کریں تو یہ ایک ایسا عمل ہے جس میں کسی نئی کھوج کی اصلیت وحقیقت کی تہ تک جا کر اس میں اصل ونقل کی چھان بین کر کے تحقیقی قواعد وضوابط کی مدد سے نتیجہ اخذ کرنا۔ سائنٹفک تحقیقی عمل میں کون کون سے مسائل حائل ہوتے ہیں۔ اس مضمون میں ان مسائل کا ذکر کیا جائے گا۔ اس سے قبل تحقیق کا طریقہ کار اور اس کے اصولیات کے درمیان فرق کی وضاحت کردی جائے۔ تحقیق کے طریقہ کار کو ان تمام طریقوں اور تکنیکوں کے طور پر سمجھا جاسکتا ہے جنہیں تحقیقی عمل کو انجام دینے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ بالفظ دیگر، وہ تمام طریقے تحقیق کے طریقے کہلاتے ہیں جنہیں تحقیق کار اپنے تحقیقی موضوع / مسلہ کے مطالعہ/حل کے دوران استعمال کرتا ہے۔ چوں کہ تحقیق کا مقصد، خاص طور پر عملی تحقیق کا مقصد کسی درپیش مسلہ کو حل کرنا ہے۔ اس لئے تحقیق سے متعلق دستیاب مواد اور موضوع کے نامعلوم پہلوؤں کا ایک دوسرے سے متعلق ہونا ضروری ہے تا کہ اس کے حل کو ممکن بنایا جاسکے۔ ان تمام چیزوں کو مدنظر رکھتے ہوئے تحقیق کے طریقوں کو مندرجہ ذیل تین گروپوں میں رکھا جاسکتا ہے:

1۔ پہلے گروپ میں ہم ان طریقوں کو شامل کرتے ہیں جو مواد کے یکجا کرنے سے متعلق ہیں۔ یہ طریقے ان جگہوں پر استعمال کئے جائیں گے جہاں پہلے سے ہی دستیاب مواد مطلوبہ حل تک پہنچنے کے لئے ناکافی ہو۔

2۔ دوسرا گروپ اس مواد کی تکنیک پر مشتمل ہے جنہیں موجود مواد اور نامعلوم کے درمیان تعلق قائم کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

3۔ تیسرا گروپ ان طریقوں پر مشتمل ہوتا ہے جنہیں حاصل شدہ نتائج کی درستگی کا اندازہ کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

مندرجہ بالا آخر کے دو گروپوں میں بیان کئے گئے تحقیق کے طریقوں کا اعتبار عام

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

طور پر تحقیق کے تجزیاتی نظریات پر ہوتا ہے۔

تحقیق کے مسائل کو منظم طریقے سے حل کرنے کو تحقیق کے اصولیات کا نام دیا جاتا ہے۔ اسے اس طور پر بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ تحقیق کے عمل کو سائنٹفک طور پر انجام دینے کے مطالعہ کا ایک علم ہے۔ اس میں ہم ان مختلف اقدامات کا مطالعہ کرتے ہیں جو عام طور پر ایک محقق ان میں موجود منطق کے ساتھ ساتھ اپنے تحقیق کے مسلہ کا مطالعہ کرنے میں اپناتا ہے۔ اب محقق کے لیے ضروری ہے کہ وہ تحقیق کے طریقوں یا تکنیکوں کو جاننے کے ساتھ ساتھ اس کے اصولیات سے بھی متعارف ہو۔ محققین کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مختلف تکنیکوں کے بنیادی مفروضات کو سمجھیں اور اس معیار کا پتہ لگائیں جس کے ذریعے یہ فیصلہ کر سکیں کہ بعض تکنیک اور طریقہ کار بعض مسائل پر لاگو ہوں گے اور بعض پر نہیں۔ بالفظ دیگر کہ محقق کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے تحقیقی موضوع کے لیے اپنے تحقیق کے طریقہ کار کا ایک ایسا خاکہ تیار کرے کہ جس سے ایک اندازہ ہو سکے۔ مثال کے طور پر، ایک معمار جو عمارت کا خاکہ تیار کرتا ہے اسے شعوری طور پر اپنے فیصلوں کی بنیاد پر اندازہ لگانا پڑتا ہے، وہ اندازہ کیوں لگاتا ہے اور کس بنیاد پر مخصوص حجم، تعداد، اور دروازوں، کھڑکیوں اور روشن دان کی جگہ کا انتخاب کرتا ہے، اسی طرح، تحقیق کے میدان میں محقق کو اندازہ کرنے کے لیے ایک خاکہ تیار کرنا ہوتا ہے۔

تحقیق کے اصولیات کے بہت سے پہلو ہیں اور تحقیق کے طریقے تحقیق کے اصولیات کا ایک حصہ تشکیل کرتے ہیں۔ تحقیق کے اصولیات کا دائرہ کار تحقیق کے طریقوں کے بالمقابل وسیع تر ہے۔ اس طرح جب ہم تحقیق کے اصولیات کی بات کرتے ہیں تو اس وقت ہم نہ صرف تحقیق کے طریقوں کے بارے میں بات کرتے ہیں بلکہ اس منطق کا بھی اعتبار کرتے ہیں جو ان طریقوں کے پیچھے موجود ہوتی ہے جس کا استعمال اپنی تحقیق کے

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

مطالعہ کے تناظر میں کرتے ہیں اور اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ کیوں ہم ایک خاص طریقہ یا تکنیک کو استعمال کرتے ہیں۔ تحقیق کا مطالعہ کیوں شروع کیا گیا ہے، تحقیق کا مسلہ کس طرح بیان کیا گیا ہے، کس طریقہ سے اور کیوں مفروضہ نظریہ کی تشکیل کی گئی ہے، کیا کیا مواد جمع کیا گیا ہے اور کون سا خاص طریقہ اپنایا گیا ہے، کیوں مطلوبہ مواد کا تجزیہ کرنے کے لیے ایک خاص تکنیک کا استعمال کیا گیا ہے اور اسی طرح کے دوسرے سوالوں کے جوابات عام طور پر دیئے جاتے ہیں۔

تحقیق اور سائنسی طریقہ:

تحقیق کی اصطلاح کو واضح طور پر سمجھنے کیلئے ایک محقق کو سائنسی طریقہ کا مطلب پتہ ہونا چاہیے۔ کارل پیرسن (Karl Pearson) نے سائنٹفک تحقیق کی جو تعریف کی ہے پیش ہے:

" The Scientific method marked by the following features
: (a) careful and accurate classification of facts
and observation of their correlation and
sequence.
(b) The discovery of scientific laws by and
of the creative imagination,
(C) self-criticism and the final touch
stone of aqual validity for all normally
constituted minds." 6

دو اصطلاحیں، یعنی تحقیق اور سائنسی طریقہ، ایک دوسرے سے کافی متعلق ہیں۔ تحقیق، جیسا کہ ہم نے پہلے ہی کہا ہے کہ کسی مخصوص مسلے کے نتائج، اسباب اور نوعیت کی تفتیش کو کہا جاتا ہے۔ محقق اگر زیادہ سے زیادہ نتائج کے بارے میں دلچسپی رکھتا ہو، اور ساتھ

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

ہی ساتھ نتائج کی تکرار پذیری اور زیادہ پیچیدہ اور عام حالات میں ان کی توسیع کے بارے میں بھی دلچسپی رکھتا ہو تو تحقیق زیادہ کامیاب ہوگی۔ دوسری طرف، فلسفہ کو عام طور پر سائنسی طریقہ کا نام دیا جاتا ہے جو فلسفہ کہ تحقیق کے تمام طریقوں اور تکنیکوں کو شامل ہوتا ہے اگرچہ وہ ایک سائنس سے دوسرے سائنس تک کافی مختلف ہو سکتے ہیں۔ اس تناظر میں، کارل پیرسن (Karl Pearson) لکھتے ہیں:

''سائنسی طریقہ ایک ہے اور اسی جیسی صورتحال (سائنس) کی دوسری شاخوں میں بھی ہے اور یہی طریقہ کار منطقی طور پر تربیت یافتہ تمام ذہنوں کا طریقہ کار ہے، تمام علوم کا اتحاد تنہا اس کے طریقوں پر مشتمل ہوتا ہے، وہ شخص جو کسی بھی قسم کے حقائق کی درجہ بندی کرتا ہے، اپنے باہمی تعلقات کو سمجھتا ہے اور ان کے نتائج کو بیان کرتا ہے، وہی سائنسی طریقہ کا استعمال کرتا ہے اور اسی کو سائنس کا آدمی کہا جاتا ہے۔'' ے

سائنسی طریقہ حق کی تلاش کو کہتے ہیں جسے منطقی سوچ کے ذریعہ مقرر کیا گیا ہے۔ سائنس کا نصب العین حقائق کے بارے میں ایک منظم باہمی تعلق کو حاصل کرنا ہے۔ سائنسی طریقہ تجربات، مشاہدے، مقبول بنیادی شرائط سے حاصل شدہ منطقی دلائل کے ذریعہ اس نصب العین کو حاصل کرنے کی کوشش ہے اور مختلف تناسب میں ان تینوں کے مجموعے کا نام ہے۔ مزید وضاحت کے لئے ایل ایل برنارڈ (L.L Bernard) کی یہ تعریف پیش ہے:

" Science may be defined in terms of six major processes that take place with in it. there are testing, verification, definition,

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

classification, organisation, orientation, which include predicution and application."8

بالا سطور میں بات منطق کی ہو رہی تھی تو سائنسی طریقہ میں منطق واضح اور درست طور پر مسائل کی تشکیل میں معاون ثابت ہوتی ہے تا کہ ان کے ممکن متبادل واضح ہوں۔ علاوہ ازیں، منطق ایسے متبادل کے نتائج کو تکمیل تک پہونچاتی ہے اور جب ان کا موازنہ قابل دید مظاہر سے کیا جاتا ہے تو محقق کے لئے یہ بیان کرنا ممکن ہو جاتا ہے کہ کون سا متبادل قابل دید حقائق کے ساتھ سب سے زیادہ ہم آہنگی رکھتا ہے۔ یہ سب تجربات اور تحقیقاتی محاسبہ کے ذریعہ کیا جاتا ہے جو سائنسی طریقہ کے لازمی حصے کو تشکیل دیتے ہیں۔

تجربات مفروضہ نظریات کی جانچ اور نئے تعلقات کو دریافت کرنے کے لیے کیے جاتے ہیں۔ لیکن تجربات کی بنیاد پر پیش آنے والے نتائج عام طور پر یا تو ناقص مفروضات، غیر تسلی بخش تجویز کیے گئے تجربات، غلط طریقہ سے عمل میں لائے ہوئے تجربات کی وجہ سے تنقید کا نشانہ بنتے ہیں یا غلط تشریحات کی بنیاد پر۔ اس طرح محقق کے لیے ضروری ہے کہ جب وہ تجرباتی خاکہ کی تکمیل کر رہا ہو تو اس کی طرف ہر ممکن توجہ دے اور صرف ممکنہ مفاہیم کو بیان کرے۔ تحقیقاتی محاسبہ کا مقصد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ سائنسی طور پر جمع کی گئی معلومات فراہم کرے تا کہ اس کی بنیاد پر محققین ان کے نتائج کے واسطے کام کر سکیں۔ اس طرح سائنسی طریقہ ان موثر بنیادی شرائط پر مبنی ہوتا ہے جنہیں درج ذیل میں بیان کیا جا رہا ہے:

1۔ یہ عملی ثبوت پر انحصار کرتا ہے۔

2۔ یہ متعلقہ تصورات کا استعمال کرتا ہے۔

3۔ یہ صرف مادی سوچ سے جڑا رہتا ہے۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

4۔ یہ اخلاقی غیر جانبداری پر مبنی ہوتا ہے یعنی اس کا مقصد موضوع کی مناسبت اور صحیح نتیجہ کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

5۔ یہ احتمالی پیشن گوئی کے نتائج کو سامنے لاتا ہے۔

6۔ اس کا طریقہ کار ان تمام لوگوں کے نزدیک معروف ہے جو تنقیدی جانچ کرتے ہیں یا نقل کے ذریعہ نتائج کو جانچتے ہیں۔

7۔ اس کا مقصد انتہائی مشہور جامع کلمات کی تشکیل کرنا ہوتا ہے یا بالفاظ دیگر اسے سائنسی نظریات بھی کہا جا سکتا ہے۔

اس طرح سائنسی طریقہ عمل کا ایک سخت اور بے لاگ طریقہ ہے جسے منطق اور مادی عمل کے مطالبات کے ذریعہ مسلط کیا جاتا ہے۔ لہذا سائنسی طریقہ ایک مادی، منطقی اور بااصول طریقہ کو کہا جاتا ہے یعنی، ایک ذاتی تعصب یا بدگمانی سے آزاد طریقہ، تصدیق کے قابل مظاہر کی ظاہری خصوصیات کو معلوم کرنے کا طریقہ، ایک ایسا طریقہ جہاں محقق کی منطقی استدلال کے قوانین کے ذریعہ رہنمائی کی جاتی ہے، ایک ایسا طریقہ جہاں تحقیقات ایک بااصول اور منظم طریقہ سے کی جائے، اور ایک ایسا طریقہ جو اندرونی مستقل مزاجی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

تحقیق کے طریقہ کار کو جاننے کی اہمیت

تحقیق کے اصولیات کا مطالعہ طالب علم کو مواد اکٹھا کرنے اور ان کو ترتیب دینے یا ان کی طرف اشارہ کرنے والے کارڈ کے لیے ضروری تربیت فراہم کرتا ہے۔ نیز خاص مسائل کے لیے مناسب اعداد وشمار کو اکٹھا کرنے کی تکنیکوں، سوالناموں، زیر تسلط تجربات، ثبوتوں کے ریکارڈ، اِسے الگ کرنے اور ان کی تشریح کے استعمال میں تربیت فراہم کرتا ہے۔ درحقیقت، تحقیق کے اصولیات یا اس کے طریقہ کار کو جاننے کی اہمیت کا اندازہ

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

مندرجہ ذیل مطالعات سے لگایا جاسکتا ہے:

(I) ایک شخص کے لیے جو تحقیقی عمل کے پیشہ کے واسطے خود کو تیار کرتا ہے تحقیق کے طریقہ کار اور اس کی تکنیکوں کو جاننے کی اہمیت واضح ہے۔ طریقہ کار کا علم اچھی تربیت فراہم کرتا ہے۔ خاص طور پر نئے تحقیق کار کے واسطے اور اسے بہتر تحقیق کرنے کے قابل بنا دیتا ہے۔ یہ اس کی باضابطہ سوچ یا دماغ کی مہارت کو بڑھانے میں کافی مدد کرتا ہے تاکہ وہ موضوع کا خارجی طور سے مشاہدہ کرسکے۔ لہذا وہ لوگ جو تحقیق میں پیشہ ورانہ عمل کی خواہش رکھتے ہیں ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ تحقیق کی تکنیکوں کے استعمال کی مہارت کو بڑھائیں اور ان کے پیچھے منطق کو اچھی طرح سمجھیں۔

(II) تحقیق کو عمل میں لانے کا علم، معقول اعتماد کے ساتھ تحقیق کے نتائج کا استعمال اور اندازہ کرنے کی صلاحیت پیدا کرے گا۔ دوسرے الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تحقیق کے طریقہ کار کا علم مختلف شعبوں میں کافی مددگار ثابت ہوگا جیسے کہ حکومت یا تجارتی انتظامیہ، عوام کی ترقی اور سماجی کام جس کے لیے لوگ زیادہ بلائے جاتے ہیں تاکہ محقق کاروائی کے واسطے تحقیق کے نتائج کا استعمال اور اندازہ کرسکے۔

(III) جب کسی کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ تحقیق کیسے کی جاتی ہے تو وہ ایک ایسا نیا شعوری آلہ حاصل کرکے مطمئن ہو جاتا ہے جو دنیا کو دیکھنے اور روزمرہ کے تجربوں کا فیصلہ کرنے کا ایک ذریعہ بن جاتا ہے۔ لہذا یہ ایسے ذی شعور فیصلے لینے کے قابل بنا دیتا ہے جو مختلف اوقات میں عملی زندگی کے اندر ہم کو پیش آنے والے مسائل سے تعلق رکھتا ہے۔ اس طرح تحقیق کے مبادیات کا علم ایسے آلات فراہم کرتا ہے جن کی بدولت ہم زندگی میں چیزوں کو معروضی طور سے دیکھتے ہیں۔

(IV) اس سائنسی دور میں ہم میں سے تمام لوگ مختلف طریقوں سے تحقیق کے نتائج

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

کے صارفین ہیں اور ہم ان کا استعمال چالاکی سے کر سکتے ہیں بشرطیکہ ہم ان طریقوں کی موزونیت کا فیصلہ کرنے کے قابل ہوں جن کے ذریعہ انہیں حاصل کیا جاتا ہے۔ تحقیق کے مبادیات کا علم تحقیق کے نتائج کے صارفین کی مدد کرتا ہے تا کہ وہ ان کا اندازہ کر سکیں اور ان کو منطقی فیصلے لینے کے قابل بناتا ہے۔

تحقیق کا عمل

تحقیق کے طریقہ کار اور تکنیک کی تفصیلات میں جانے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تحقیق کے عمل کا ایک مختصر جائزہ پیش کر دیا جائے۔ تحقیق کا عمل یا تو اعمال کے سلسلوں پر مشتمل ہوتا ہے یا مؤثر طریقے سے تحقیق کو عمل میں لانے کے ضروری اقدامات اور ان اقدامات کے مطلوبہ ترتیب پر مشتمل ہوتا ہے۔ ایک شخص کو یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ تحقیق کے عمل میں شامل مختلف اقدامات ایک دوسرے کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں اور نہ ہی وہ الگ اور ممتاز ہیں۔ وہ کسی مخصوص ترتیب میں ضروتاً ایک دوسرے کی اتباع نہیں کرتے اور محقق ہر قدم پر تحقیق کے عمل میں بعد کے اقدامات کے مطالبات کی مسلسل توقع رکھتا ہے۔ بہر حال مندرجہ ذیل ترتیب جو مختلف اقدامات سے تعلق رکھتی ہے تحقیق کے عمل کے بارے میں ایک مفید عملی رہنمائی فراہم کرتی ہے:

1۔ تحقیق کے مسلے یا موضوع کو تشکیل دینا

2۔ ادب کا وسیع مطالعہ کرنا

3۔ مفروضہ نظریہ کو آگے بڑھانا

4۔ تحقیق کا خاکہ تیار کرنا

5۔ خاکہ کا تعین کرنا

6۔ مواد جمع کرنا

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

7۔ منصوبہ پر عمل درآمد

8۔ مواد کا تجزیہ کرنا

9۔ مفروضہ نظریہ کو جانچنا

10۔ عمومیات اور تشریح اور

11۔ رپورٹ کو تیار کرنا یا نتائج کو پیش کرنا یعنی حاصل شدہ نتائج کو باقاعدہ مرتب کرنا۔

مندرجہ بالا اقدامات کا ایک مختصر تعارف تحقیق کے عمل کو سمجھنے کے لیے کافی مددگار ثابت ہوگا۔

1۔ تحقیق کے مسائل کو تشکیل دینا:

تحقیق کے مسائل کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ جو نوعیت کیحالات سے تعلق رکھتی ہے اور دوسری وہ جو متنوعات کے درمیان آپسی تعلقات سے متعلق ہیں۔ بالکل شروع ہی میں محقق کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس مسئلہ کو الگ کردے جس کا وہ مطالعہ کرنا چاہتا ہے یعنی اپنی سرگرمی کے عام حصے یا موضوع کے پہلو جن کی وہ تحقیقات کرنا چاہتا ہے ان دونوں چیزوں کا اسے فیصلہ کرنا واجب ہے۔ ابتدائی طور پر مسئلہ کو ایک وسیع اور عام طور پر بیان کیا جاسکتا ہے اور پھر مسئلہ سے متعلق اگر کوئی ابہام ہو تو اس کو دور کیا جاسکتا ہے۔ پھر ایک خاص حل کے امکانات پر مسئلہ کی عملی تشکیل مقرر کرنے سے پہلے غور کیا جائے گا۔ اس طرح سے ایک مخصوص تحقیق کے مسئلہ میں ایک عام موضوع کی تشکیل سائنسی تحقیقات میں پہلے مرحلہ کو مقرر کرتی ہے۔ بنیادی طور پر تحقیق کے مسئلہ کو تشکیل دینے میں دو مراحل شامل ہوتے ہیں یعنی مسئلہ کو اچھی طرح سمجھنے اور پھر اس کو ایک تجزیاتی نقطہ نظر سے بامعنی اصطلاحات میں مختلف الفاظ کے ذریعہ تشکیل دینا۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

مسئلہ کو سمجھنے کا سب سے بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس پر اپنے ساتھیوں کے ساتھ یا ان لوگوں کے ساتھ جنہیں اس معاملے میں کچھ مہارت ہے بات چیت کی جائے۔ ایک تعلیمی ادارے میں محقق ایک رہنما سے مدد حاصل کر سکتا ہے جو عام طور پر ایک تجربہ کار شخص ہوتا ہے اور اس کے ذہن میں تحقیق کے کئی مسائل ہوتے ہیں۔ اکثر رہنما عام اصطلاحات میں مسئلہ کو سامنے رکھتا ہے اور یہ محقق پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ اسے محدود کرے اور عملیاتی اصطلاحات میں مسئلہ کو بیان کرے۔ نجی کاروباری اکائیوں یا سرکاری تنظیموں میں مسئلہ عام طور پر انتظامی ایجنسیوں کی طرف سے مختص ہوتا ہے جن کے ساتھ محقق بات چیت کر سکتا ہے کہ دراصل مسئلہ کس طرح سامنے آیا اور اس کے ممکنہ حل کے لیے کیا تدبیریں کام آسکتی ہیں۔

محقق کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک ہی وقت میں موجود تمام ادب کا جائزہ لے تا کہ منتخب مسئلہ سے واقف ہو سکے۔ وہ دو قسم کے ادب کا جائزہ لے سکتا ہے، ایک تصوراتی ادب جو تصورات اور نظریات کے بارے میں ہے اور دوسرا عملی ادب جو پہلے کے مطالعے پر مشتمل ہوتا ہے اور وہ مطالعے مجوزہ مطالعے کے مشابہ ہوتے ہیں۔ اس جائزہ کا بنیادی نتیجہ یہ ہوگا کہ عملیاتی مقاصد کے۔ لیے اعداد وشمار اور دیگر مواد کے بارے میں معلومات ہو جائے گی جو محقق کو اس قابل بنا دیں گی کہ وہ اپنے ذاتی تحقیق کے مسئلہ کو ایک بامعنی تناظر میں وضاحت کر سکے۔ اس کے بعد محقق مسئلہ کو تجزیاتی یا عملیاتی اصطلاحات میں مختلف الفاظ کے ذریعہ تشکیل دیتا ہے۔ یعنی ہر ممکن اصطلاحات کے طور پر مسئلہ کو رکھنے کے لیے، تحقیق کے مسئلہ کو تشکیل دینے یا وضاحت کرنے کا یہ کام پوری تحقیق کے عمل میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس مسئلہ کو انتہائی وضاحت کے ساتھ بیان کرنا ضروری ہے جس کی تحقیق باقی ہے کیوں کہ وہ متعلقہ اعداد وشمار کو غیر متعلقہ اعداد وشمار سے الگ کرنے میں مدد کرے گا۔ بہر

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

حال مسئلہ کے بارے میں پس منظر حقائق کی صحت اور مادیت کی تصدیق کرنے میں ضرور محتاط رہنا چاہیے۔ پروفیسر W.A. Neiswanger نے درست کہا ہے کہ مادہ کا بیان بنیادی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ یہ جمع کیے جانے والے اعداد وشمار، متعلقہ اعداد وشمار کی خصوصیات، زیرِ جستجو تعلقات اور ان جستجو میں استعمال کی جانے والی تکنیکوں کا انتخاب اور حتمی رپورٹ کی شکل کا تعین کرتا ہے۔ اگر اس قسم کی مناسب اصطلاحات پائی جائیں تو ان کو مسلہ کی تشکیل کے عمل کے ساتھ ساتھ واضح طور پر بیان کرنا چاہئے۔ درحقیقت مسلہ کی تشکیل اکثر ایک سلسلہ وار نمونہ کی اتباع کرتی ہے جہاں تشکیلات کی ایک بڑی تعداد کو مقرر کیا جاتا ہے۔ ہر تشکیل پہلی تشکیل سے زیادہ مخصوص ہوتی ہے، مزید تجزیاتی اصطلاحات میں مختلف الفاظ کے ذریعہ بیان کی جاتی ہے اور دستیاب اعداد وشمار اور سائل کے لحاظ سے زیادہ حقیقت پسندانہ ہوتی ہے۔

2۔ ادب کا وسیع مطالعہ کرنا:

ایک بار جب مسلہ کو تشکیل دے دیا جائے تو اس کا ایک مختصر خلاصہ بیان کر دینا چاہئے۔ ایک تحقیق کار کے لیے جو پی ایچ ڈی کی ڈگری کیلئے مقالہ لکھ رہا ہے لازمی ہے کہ وہ اپنے موضوع کا مجوزہ خاکہ تیار کرے اور اسے منظوری کے لیے ضروری کمیٹی یا ریسرچ بورڈ میں جمع کرے۔ اس وقت محقق کو ادب کا وسیع مطالعہ کرنا چاہیے جو کہ مسئلہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس مقصد کے واسطے اشاریات اور روزنامچے اور شائع شدہ یا غیر شائع شدہ کتابیات کا سب سے پہلے پتہ کرنا ہے۔ تعلیمی روزنامچے، کانفرنسوں کی کارروائیاں، سرکاری رپورٹ وغیرہ کو مسئلہ کی نوعیت پر منحصر ہوتے ہوئے ضرور استعمال کرنا چاہیے۔ اس عمل میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ایک ماخذ دوسرے ماخذ کی طرف لے جائے گا۔ اگر پہلے کیے ہوئے مطالعے ہوں جو کہ موجودہ مطالعے

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

سے ملتے جلتے ہوں تو ان کا مطالعہ احتیاط سے کرنا چاہئے۔ ایک اچھی لائبریری اس مرحلہ میں محقق کے لیے کافی معاون ثابت ہوگی۔

3۔ بنائے ہوئے مفروضہ نظریہ کو آگے بڑھانا:

ادب کے وسیع مطالعہ کے بعد محقق کو چاہیے کہ وہ واضح اصطلاحات میں بنائے ہوئے مفروضہ نظریہ یا نظریات کو بیان کرے۔ بنایا ہوا مفروضہ نظریہ ایک عارضی مفروضہ ہے جسے اس کے منطقی یا عملی نتائج کا خاکہ بنانے اور جانچنے کے واسطے بنایا گیا ہے۔ وہ طرز خاص طور پر کافی اہم ہوتا ہے جس پر تحقیق کے مفروضات آگے بڑھائے جاتے ہیں کیونکہ وہ تحقیق کے لیے مرکزی نقطہ فراہم کرتے ہیں۔ وہ اس طرز کو بھی متاثر کرتے ہیں جس طرز پر اعداد وشمار کا تجزیہ کرنے میں آزمائشوں اور جانچوں کو عمل میں لایا جاتا ہے اور بالواسطہ طور پر اعداد وشمار کی خصوصیت جو تجزیہ کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ تحقیق کے زیادہ اقسام میں بنائے ہوئے مفروضہ نظریہ کو آگے بڑھانا انتہائی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ مفروضہ نظریہ بہت ہی مواد اور موجودہ تحقیق کے حصہ تک محدود ہونا چاہیے کیونکہ اسی کو جانچنا ہوتا ہے۔ مفروضہ نظریہ کا کردار یہ ہے کہ وہ تحقیق کے حصہ کی حد بندی کر کے محقق کی رہنمائی کرے اور اس کو صحیح راستے پر لائے۔ یہ اس کی سوچ کو گہری کر دیتا ہے اور مسئلہ کے زیادہ اہم پہلوؤں پر توجہ مرکوز کرتا ہے۔ یہ ضروری اعداد وشمار کی قسم اور استعمال ہونے والے اعداد وشمار کے تجزیہ کے طریقوں کی قسم کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔

ایک شخص بنائے ہوئے مفروضہ نظریات کو کس طرح آگے بڑھاتا ہے؟ اس کا جواب مندرجہ ذیل نقطہ نظر کا استعمال کر کے دیا جا سکتا ہے:

الف۔ مسئلہ کی اصل اور حل کی تلاش میں ساتھیوں اور ماہرین کے ساتھ بات چیت کرنا۔

ب۔ ان دستیاب اعداد وشمار اور دستاویز کو جانچنا جو ممکن رجحانات، خصوصیات اور دیگر

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

نشانات سے تعلق رکھتے ہیں۔

ج۔ موضوع سے ملتے جلتے دیگر مطالعے یا مشابہ مسائل کے مطالعے کا جائزہ لینا۔

د۔ ذاتی گہری تفتیش کرنا، جو غرض مند جماعتوں اور افراد کے ساتھ اصل موضوع پر انٹرویو سے حاصل ہوتی ہے، تا کہ مسئلہ کے عملی پہلوؤں میں زیادہ سے زیادہ بصیرت کو حاصل کر سکے۔

اس طرح بنائے ہوئے مفروضہ نظریات موضوع کے بارے میں حقیقت پر مبنی سوچ، دستیاب اعداد و شمار اور مواد کی جانچ پڑتال، ساتھ ہی ساتھ متعلقہ مطالعے اور ماہرین کے مشورہ کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ بنائے ہوئے مفروضہ نظریات اس وقت زیادہ مفید ہوتے ہیں جب انہیں عین مطابق اور واضح الفاظ میں بیان کیا جائے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ کبھی کبھار ہمیں کسی ایسے مسلہ کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے جہاں بنائے ہوئے مفروضہ نظریات کی ضرورت نہیں ہوتی ہے، خاص طور پر گہری یا تشکیلاتی تحقیقات کے حالات میں جن کا مقصد مفروضہ نظریہ کو جانچنا نہیں ہوتا ہے۔ لیکن عام اصول تو یہ ہے کہ بنائے ہوئے مفروضہ نظریات کو متعین کرنا تحقیق کے بہت سارے مسائل میں تحقیق کے عمل کا ایک دوسرا بنیادی مرحلہ ہے

4۔ تحقیق کا خاکہ تیار کرنا:

تحقیق کے مسلہ کو واضح الفاظ میں تشکیل دیتے ہوئے محقق کے لئے ضروری ہے کہ وہ تحقیق کا ایک خاکہ تیار کرے، یعنی اسے تصوراتی ساخت بیان کرنا ہوگا جس کے تحت تحقیق کو عمل میں لایا جائے گا۔ اس طرح کا خاکہ تیار کرنے سے تحقیق ایک ممکنہ حد تک موثر ثابت ہوتی ہے اور زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کرتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں تحقیق کے خاکہ کا مقصد یہ ہے کہ وہ متعلقہ ثبوت کو جمع کرنے کے لیے کم سے کم کوشش، وقت اور پیسے

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

کے اخراجات کو فراہم کرے۔ لیکن ان تمام چیزوں کا حاصل ہونا بنیادی طور پر تحقیق کے مقصد پر انحصار کرتا ہے۔ تحقیق کے مقاصد کی چار قسموں میں درجہ بندی کی جا سکتی ہے، یعنی (i) انکشاف (ii) کیفیت (iii) تشخیص (iv) تجربات۔ جب تحقیق کا مقصد کسی حالت یا متنوعات کے درمیان تعلق کو درست طور پر واضح کرنا ہو تو مناسب خاکہ وہ ہوگا جو میلان کو کم کر یا ور جمع اور تجزیہ کیے ہوئے اعداد و شمار کے اعتماد کو بڑھائے۔

تحقیق کے بہت سارے خاکے ہیں جیسے تجرباتی اور غیر تجرباتی مفروضہ نظریہ کو جانچنا۔ تجرباتی خاکے یا تو غیر رسمی خاکے ہو سکتے ہیں (جیسا کہ تسلط کے بغیر پہلے اور بعد میں، تسلط کے ساتھ صرف بعد میں، تسلط کیساتھ پہلے اور بعد دونوں میں) یا رسمی خاکے ہو سکتے ہیں (جیسا کہ مکمل طور پر بے ترتیب خاکہ، بے ترتیب ہموار خاکہ، سادہ اور پیچیدہ جزوی خاکہ) جن میں سے محقق کو اپنے منصوبے کے لئے ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔

تحقیق کے خاکہ کو تیار کرنا جو کہ ایک مخصوص تحقیق کے مسئلہ کے لئے مناسب ہو، عام طور پر مندرجہ ذیل عوامل پر غور کرنے کو شامل ہوتا ہے:

1۔ معلومات حاصل کرنے کے ذرائع

2۔ محقق اور اس کے عملہ کی مہارت اور دستیابی (اگر کوئی ہوں)

3۔ انتخاب کی طرف لے جانے والے استدلال کو بیان کرنا، اور اس طریقہ کی وضاحت کرنا جس میں معلومات حاصل کرنے کے منتخب ذرائع کو منظم رکھا گیا ہو۔

4۔ تحقیق کے لئے دستیاب وقت،

5۔ تحقیق سے متعلق خرچ کا عنصر یعنی مقصد کے واسطے دستیاب رقم۔

5۔ نمونہ خاکہ کا تعین :

تحقیق کے کسی بھی مسئلے میں تمام زیر غور معلومات مثبت نتائج سامنے لاتی

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

ہیں۔لیکن نمونہ خاکہ کے لئے ایک اہم مثال پیش کی جاتی ہے کہ جس طرح آبادی میں تمام اشیائے کوشمار کرنے کومردم شماری کی تفتیش کہا جاتا ہے۔ یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ اس طرح کی تفتیش میں جب تمام اشیائے شامل ہوجاتے ہیں تو موقع کا کوئی بھی عنصر باقی نہیں رہتا اور انتہائی اعلی درجہ کی درستگی حاصل ہوتی ہے۔لیکن عملی طور پر یہ سچ نہیں ہوسکتا۔اس طرح اس جیسی تفتیش میں تعصب کا ایک معمولی عنصر موجود ہوتا ہے۔مزید یہ کہ تعصب کے عنصر یا اس کی حد کو جانچنے کا کوئی راستہ نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ نمونہ کی جانچ کے استعمال، یا دوبارہ جائزہ کے ذریعہ اس کی جانچ کی جائے۔اس کے علاوہ، اس قسم کی تفتیش وقت، پیسہ اور توانائی کی ایک بڑی مقدار کوشامل ہوتی ہے۔صرف یہی نہیں بلکہ مردم شماری کی تفتیش بھی بہت سارے حالات میں عملی طور پر ممکن نہیں ہے۔مثال کے طور پر، خون کی جانچ صرف نمونہ کی بنیاد پر کی جاتی ہے۔لہذا، اکثر وبیشتر ہم اپنے مطالعہ کے مقاصد کے لیے صرف چند اشیاء کو کائنات سے منتخب کرتے ہیں۔منتخب اشیاء ان چیزوں کو تشکیل دیتے ہیں جنہیں تکنیکی طور پرنمونہ کہا جاتا ہے۔

محقق کے لیے ضروری ہے کہ وہ نمونہ کے انتخاب کے طریقہ کا فیصلہ کرے یا اس چیز کا جسے عام طور پرنمونہ خاکہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔نمونے یا تو امکانی نمونے ہوسکتے ہیں یا غیر امکانی نمونے۔امکانی نمونے کی بدولت ہر ایک عنصر کونمونہ میں شامل ہونے کا معروف امکان ہے، لیکن غیر امکانی نمونے محقق کواس بات کی اجازت نہیں دیتے ہیں کہ وہ اس امکان کا تعین کرسکے۔امکانی نمونے وہ ہیں جو معمولی غیر منظّم نمونے، منظّم نمونے، طبق دار نمونے اور خوشہ دار نمونے پر مبنی ہوتے ہیں جبکہ غیر امکانی نمونے وہ ہیں جو موزوں نمونے، فیصلہ نمونے اور معین مقدار نمونے کی تکنیکوں پر مبنی ہوتے ہیں۔

6۔ مواد جمع کرنا:

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

کسی بھی تحقیقی مسئلہ سے نمٹنے میں اکثر یہ محسوس ہوتا ہے کہ دستیاب مواد ناکافی ہے، اور اسی وجہ سے مناسب مواد کو جمع کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ مناسب مواد جمع کرنے کے کئی طریقے ہیں جو رقم کے اخراجات، وقت اور محقق کے پاس موجود دیگر وسائل کے تناظر میں کافی مختلف ہوتے ہیں۔

ابتدائی مواد یا تو تجربہ کے ذریعہ جمع کیا جاسکتا ہے یا معائنہ کے ذریعہ۔ اگر محقق کوئی تجربہ کرتا ہے تو وہ کچھ مقداری پیمائش کا مشاہدہ کرتا ہے جن کی مدد سے اپنے مفروضات میں شامل حقائق کو جانچتا ہے۔ لیکن معائنہ کی صورت میں مندرجہ ذیل طریقوں میں سے کسی ایک یا کئی طریقوں کے ذریعہ مواد اکٹھا کیا جاسکتا ہے:

الف۔ مشاہدہ کے ذریعہ:

یہ طریقہ محض محقق کے ذاتی مشاہدہ کے ذریعہ معلومات کو جمع کرنے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ حاصل کردہ معلومات موجودہ صورت حال سے متعلق ہوتی ہیں اور ماضی کے کرداروں سے یا مستقبل کے کرداروں یا ماہرین سے مطلوبہ جوابات کے رویوں سے پیچیدہ نہیں ہوتی ہیں۔ یہ طریقہ بیشک ایک مہنگا طریقہ ہے اور اس طریقہ کے ذریعہ فراہم کی گئی معلومات بھی بہت محدود ہیں۔ اس طرح یہ طریقہ ایسی تحقیقات میں مناسب نہیں ہے جن سے بڑے نمونے تعلق رکھتے ہیں۔

ب۔ ذاتی انٹرویو کے ذریعہ:

محقق ایک سخت طریقہ کار کو اختیار کرتا ہے اور ذاتی انٹرویو کے ذریعہ پہلے سے بنائے ہوئے سوالات کے مجموعہ کے جوابات تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ معلومات کو جمع کرنے کا یہ طریقہ عموماً تشکیل شدہ طور پر عمل میں لایا جاتا ہے جہاں نتیجہ ایک بڑی حد تک انٹرویو لینے والے کی صلاحیت پر منحصر ہوتا ہے۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

ج۔ ٹیلی فون انٹرویو کے ذریعہ:

معلومات جمع کرنے کا یہ طریقہ ٹیلی فون سے رابطہ کرنے کو شامل ہوتا ہے۔ یہ بہت ہی استعمال کیے جانے والا طریقہ نہیں ہے بلکہ یہ ترقی یافتہ عہد کے صنعتی معائنے میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے، خاص طور پر ممکنہ معلومات کو ایک بہت ہی محدود وقت میں مکمل کیا جا تا سکتا ہے۔

د۔ سوالناموں کو میل کرنے کے ذریعہ:

اگر معلومات حاصل کرنے کے لئے اس طریقہ کو اپنایا جائے تو محقق اور جواب دینے والے ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ میں آتے ہیں۔ سوالنامے بذریعہ میل جواب دینے والوں کو اس درخواست کیساتھ ارسال کیے جاتے ہیں کہ انہیں مکمل کرنے کے بعد واپس کردیں۔ یہ انتہائی وسیع پیمانے پر مختلف اقتصادی اور کاروباری معائنوں میں استعمال کیا جانے والا طریقہ ہے۔ اس طریقہ کو اپنانے سے پہلے عام طور پر سوالنامہ کو جانچنے کے لیے ایک معمولی مطالعہ کی طرف رجوع کیا جاتا ہے جس سے ان کمزوریوں کا پتہ چلتا ہے جو سوالنامہ میں پائی جاتی ہیں۔ استعمال کیے جانے والے سوالنامہ کو کافی احتیاط سے تیار کیا جانا چاہئے تا کہ متعلقہ معلومات جمع کرنے کے لئے موثر ثابت ہوسکے۔

محقق کے لیے ضروری ہے کہ وہ معلومات کو جمع کرنے کے لئے ان طریقوں کا انتخاب کرے اور ساتھ ہی تفتیش کی نوعیت، تحقیق کا عنصر اور مقصد، مالی وسائل، دستیاب وقت اور درستگی کے مطلوبہ درجہ کے بارے میں غور کرے۔ اگر چہ اسے ان تمام عوامل پر توجہ دینا چاہئے لیکن زیادہ چیزیں محقق کی صلاحیت اور تجربہ پر منحصر ہوتی ہیں۔ اس تناظر میں ڈاکٹر A.L.Bowley بہت ہی موزوں طریقہ سے رائے زنی کرتے ہیں کہ شماریاتی مفروضات کو جمع کرنے میں معمولی فہم و فراست بنیادی ضرورت ہوتی ہے جو اہم استاد کا

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

تجربہ کرتی ہے۔

7۔ منصوبہ پر عمل درآمد کرنا:

منصوبہ پر عمل درآمد کرنا تحقیق کے اندر انتہائی اہم قدم ہوتا ہے۔ اگر منصوبہ کی تنفیذ زیادہ ہوتی ہے تو جمع کی گئی معلومات یا مواد سے درآمد نتائج کافی اور قابل اعتماد ہونگے۔ محقق کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ منصوبہ کو ایک منظم طریقہ سے اور وقت پر نافذ کیا جائے۔ اگر معلومات تشکیل شدہ سوالناموں کے تحت مختلف وسائل کے ذریعہ کی جاتی ہے تو معلومات آسانی سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔

8۔ مفروضات کو جانچنا:

ہر تحقیق سے پہلے ایک تحقیق موجود ہوتی ہے بعد کے محقق کو پہلے سے موجود نتائج کو پرکھنا اور چھانٹنا ہوتا ہے اور یہ ہی تحقیق کی شہ رگ ہے۔ مطلوبہ یا موجود مواد کا تجزیہ کرنے کے بعد محقق ان مفروضات کی آزمایش کرسکتا ہے جنہیں وہ پہلے ہی تشکیل دے چکا ہے۔ کیا مطلوبہ ماخذ ایک سے زائد جگہ بھی ملتا ہے یا نہیں؟ کیا جو مواد جمع کیا ہے وہ اہم ہے؟ کیا جن ذرایع سے معلومات حاصل کی گئی ہیں وہ معتبر ہیں یا نہیں؟ اس نوعیت کے بے شمار سوالات کا اعتبار یہاں ہوتا ہے۔ تحقیق کے لئے غیر جانبدارانہ طبیعت کا رکھنا مستقل مزاجی کا ثبوت ہے۔ پہلے سے موجود تحقیقی مواد کو حرف آخر نہیں سمجھنا چاہیے خواہ وہ کتنا بھی معیاری کیوں نہ ہو، اُسے شک کی نظر سے دیکھنا ہی اچھے محقق کی پہچان ہے۔ متشکک محقق کی تعریف ڈی ایلٹک کی اس طرح کی ہے:

"اچھا محقق ہونے کے لئے اچھا متشکک ہونا ضروری ہے۔"[9]

10۔ عمومیات اور تشریح:

اگر مواد کو جانچا جائے اور اسے کئی بار برقرار رکھا جائے تو محقق کے لیے یہ ممکن ہو

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

سکتا ہے کہ ایک نظریہ قائم کرنے کے لیے عمومیت تک پہونچ جائے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ تحقیق کی اصل قیمت اس کے ایک خاص قسم کے عمومیات تک پہنچنے کی صلاحیت میں پنہاں ہوتی ہے۔ اگر محقق کے پاس شروع کرنے کے لیے کوئی مفروضہ نہیں ہے تو اسے کچھ نظریہ کی بنیاد پر اپنے نتائج کی وضاحت کرنی چاہیے، اسے تشریح کے نام سے جانا جاتا ہے۔ تشریح کا عمل اکثر نئے سوالات کو جنم دے سکتا ہے جو بدلے میں مزید تحقیقات کی طرف لے جاسکتے ہیں۔

11۔ رپورٹ یا مقالہ تیار کرنا:

آخر میں محقق کو اپنی طرف سے کیے گئے عمل کی رپورٹ یا ایک مکمل مکالہ تیار کرنا ہوتا ہے۔ مقالہ مندرجہ ذیل نقطہ نظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے انتہائی احتیاط کے ساتھ تیار کیا جانا چاہیے۔

1۔ مقالے کی ترتیب مندرجہ ذیل طور پر ہونی چاہیئے:

الف۔ ابتدائی صفحات

ب۔ بنیادی متن

ج۔ آخری جزو

اس کے ابتدائی صفحات میں مقالے کا عنوان ہوگا اس کے بعد منظوریاں اور پیش لفظ ہوگا۔ پھر مضامین کی ایک فہرست ہوگی۔

مقالے کا بنیادی متن مندرجہ ذیل حصوں میں ہونا چاہیے:

الف۔ تعارف:

اس کے اندر تحقیق کے مقصد کی توضیح اور تحقیق کی تکمیل میں اپنائے گئے طریقہ کار کی وضاحت ہوگی۔ اور ساتھ ہی ساتھ مختلف پابندیوں کے ساتھ مطالعہ کی وسعت کا بھی

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

ذکر ہوگا۔

ب۔ نتائج کا خلاصہ:

تعارف کے بعد غیر تکنیکی زبان میں نتائج اور سفارشات کا ذکر ہوگا۔ اگر نتائج وسیع ہیں تو ان کا خلاصہ بیان کیا جائے گا۔

ج۔ بنیادی رپورٹ:

رپورٹ کا بنیادی حصہ منطقی ترتیب میں پیش ہوگا اور بآسانی قابل شناخت حصوں میں تقسیم ہوگا۔

د۔ نتیجہ:

بنیادی متن کے آخر میں محقق واضح اور باقاعدہ طور پر اپنی تحقیق کے نتائج پیش کرے گا۔ درحقیقت یہ آخری خلاصہ مطالب ہوگا۔

مقالے کے آخر میں تمام معلومات اور تکنیکی اعداد و شمار کے تعلق سے ضمیمے کا بیان ہوگا۔ کتابیات، یعنی کتابیں، روزنامچے اور رپورٹ وغیرہ کی فہرست کا بھی آخر میں ذکر ہوگا۔ شائع شدہ تحقیقی مقالے میں خاص طور پر اشاریہ کا بیان ہوگا۔

2۔ مقالہ ایک جامع اور معروضی انداز میں سادہ زبان میں تیار کیا جائیگا اور مبہم تعبیرات جیسا کہ "ایسا لگتا ہے"، "ایسا ہوسکتا ہے" اور اس جیسے دوسرے الفاظ سے اجتناب کیا جائے گا۔

3۔ بنیادی رپورٹ میں نقشے اور تصاویر اگر معلومات کو زیادہ واضح طور پر پیش کررہے ہوں تو انہیں استعمال کیا جائے گا۔

4۔ موزوں "اعتماد کی حد" کو بیان کرنا ضروری ہوگا اور تحقیقی عمل کے دوران آنے والی مختلف رکاوٹوں کو بھی بیان کیا جائے گا۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

5۔ مقالہ مکمل کرنے کے بعد ضروری ہے ''نظر ثانی'' کی جائے جس میں زبان کی درستگی اور اہم پہلوؤں کی طرف توجہ دی جاتی ہے۔ محقق کے لئے ضروری ہے کہ وہ زبان و بیان کے لئے اہم امور کا خیال برتنے میں محتاط رہے مثلاً اپنی رائے کا آسان زبان میں اظہار، لفاظی سے پرہیز، مخففات سے پاک، علاقائی زبان میں رائج مخصوص الفاظ سے بچنا اور مبالغہ آرائی کا استعمال نہ کرنا وغیرہ۔

حواشی

1۔ عندلیب شادانی: ادبی ولسانی تحقیق اصول اور طریقہ کار، مرتبہ عبدالستار دلوی، شعبہ اردو ، بمبئی یونیورسٹی، بمبئی۔ باراول 1984، ص 89۔

2۔ قاضی عبدالودود: ایضاً ص، 77۔

3۔ جمیل جالبی: نئی تنقید، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس دہلی باردوم 1994، ص 22

4. WWW. OED.COM

5. WWW. OXFORD REFFERENCE .COM

6. Research Methodology; The Discipline and its dimensions. by Dr. Jai Narain Sharma, deep and deep publications pvt.ltd new delhi. page no. 67

7. Research Methodology; .....do ....do P.no 65

8. Research Methodology;......do ..... do P.no 67

9. The Art of literary research ; By Richard D.Altick...Norton&lo new york. Page no. 16

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

اردو ادب میں ترقی پسندی کے ابتدائی نقوش

ہندوستان میں انگریزی سامراج کا دبدبہ انیسویں صدی کی ابتدا ہی سے قائم ہو چکا تھا۔ بہت سی ریاستوں کے اپنے راجا تھے۔ (حالانکہ ابھی آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر دہلی کے تخت پر قابض تھا) لیکن یہ سب انگریزوں کے خریدے ہوئے تھے۔ ہندوستانی سیاست میں اب ان راجاؤں کا رول بھی برائے نام رہ گیا تھا۔ جو کچھ ہو رہا تھا وہ سب انگریزوں کے فائدے اور ہندوستان کو پوری طرح غلامی میں پھانسنے کے لیے ہو رہا تھا۔ ہندوستانیوں سے اُن کی وقعت، عزت، حکومت سب کچھ دھیرے دھیرے چھنتا چلا جا رہا تھا۔ انگریزوں کے قدم یہاں پوری طرح جم گئے تھے۔ حالات کافی تیزی سے بدل رہے تھے۔ اسی دوران 1857ء کی بغاوت شروع ہوئی۔ یہ لڑائی محض کوئی حادثہ نہیں تھی بلکہ اس کا ایک پورا سیاسی، مذہبی اور سماجی پس منظر تھا۔ انگریز آہستہ آہستہ دیسی ریاستوں پر مختلف بہانوں سے اپنا اقتدار مسلط کر رہے تھے۔ دوسری طرف اودھ کا الحاق اور مغل سلطنت کا لال قلعے میں سمٹ کر رہ جانے سے عوام میں بے چینی اور غصّہ پیدا ہو رہا تھا۔ چربی لگے کارتوس نے عوام کے غصّے کو اور بڑھکایا۔ 18/اپریل 1857ء کو منگل پانڈے کی پھانسی نے دیسی سپاہیوں کے ضبط کو توڑ دیا اور بالآخر ان شعلوں نے آگ کی شکل اختیار کی جو 10/مئی

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

1857ء کومیرٹھ میں اچانک بھڑک اُٹھی۔

1857ء کی بغاوت سیاسی حوالے سے ناکام ہوئی لیکن ناکام بغاوت نے آنے والے زمانے میں ہندوستانی زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہیں سے جدید ہندوستان کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ مغل سلطنت کا پوری طرح خاتمہ اور برطانوی سامراج کے استحکام کا اثر ہندوستان کی تہذیبی، تمدنی اور علمی وادبی میدانوں میں دن بہ دن بڑھتا جارہا تھا۔ ہندوستان میں اب نئے دور کا آغاز ہورہا تھا۔ مشرقی اقدار پر مغربی سحر تیزی سے اثر انداز ہورہا تھا۔ اسی دوران میں سرسید اور اُن کے رفقاء جن میں محسن الملک، ڈپٹی نذیر احمد، الطاف حسین حالؔی، محمد حسین آزادؔ قابل ذکر ہیں، آسمان ادب پر نمودار ہوئے۔ علمی وادبی میدانوں میں اجتہاد کی داغ بیل پڑرہی تھی اور ایک نیا فکری دبستان تشکیل پارہا تھا۔ ادب میں ہر نئے تجربے اور تبدیلی کا کھلے دل اور جوش کے ساتھ خیر مقدم ہورہا تھا۔ فراق گورکھپوری کے الفاظ میں۔

> ''انگریزی راج یوں تو 1857ء کے غدر کے پہلے ہی قائم ہو چکا تھا لیکن 1857ء کے بعد ملک بھر کو اس کا احساس ہوا کہ گویا ہم سے کوئی چیز چھین لی گئی ہے اور ادب میں یہ احساس حالؔی اور ان کے ہم عصروں (شبلؔی، آزاد، نذیر احمد، سرشار) کے کارناموں میں کارفرما نظر آتا ہے۔ اب پہلے پہل ادب برائے ادب کا نظریہ ادب برائے زندگی کے نظریے سے بدلتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور زندگی بھی محض وجدانی یا داخلی زندگی نہیں بلکہ عملی، کاروباری، سماجی اور ملی زندگی۔ حالؔی اور ان کے رفقاء نے ادب میں افادی پہلو پیدا کیے اور ان افادی پہلوؤں کو اجاگر کرنا شروع کیا۔[1]

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

اُردو ادب میں جدید رجحانات اور تجربوں کو فروغ دینے کے لیے لاہور میں مولانا محمد حسین آزادؔ نے ''انجمن پنجاب'' کی بنیاد ڈالی۔ اس سلسلے میں میجر فلر اور کرنل ہالرائڈ کی سرپرستی انہیں حاصل تھی۔ ان دونوں نے آزادؔ کی بڑی حوصلہ افزائی کی۔ چونکہ ان دنوں مشاعروں کا بڑا رواج تھا اور ان مشاعروں میں مصرع طرح دیا جاتا تھا اور شعرا اسی مصرعے کی زمین میں طبع آزمائی کیا کرتے تھے۔ مولانا آزادؔ نے ایک جدید طرز کے مشاعرے کا آغاز کیا۔ ہر مشاعرے کے لیے ایک موضوع دیا جاتا تھا جس پر شاعروں سے نظمیں لکھ کر لانے کو کہا جاتا تھا اور اس طرح یہیں سے اردو میں جدید نظم نگاری کی باقاعدہ ابتداء ہوتی ہے۔ انجمن پنجاب کے جلسوں میں علمی و ادبی مضامین بھی پڑھے جاتے تھے۔ 1867ء میں انجمن کے ایک جلسے میں آزادؔ نے ایک مضمون پیش کیا جس میں انہوں نے شعر کے متعلق ایک جدید نظریہ پیش کیا۔ انہوں نے شاعری کے سلسلے میں بہت سے مفید مشورے دیے۔ آزادؔ کا ایک مشورہ یہ ہے کہ ہمارے شاعروں کو انگریزی شاعری سے استفادہ کرنا چاہیے۔ ہمیں اپنی شاعری میں نئے انداز اور نئی تکنیکوں کا استعمال کرنا چاہیے اور نئے نئے موضوعات کی طرف بھی توجہ دینی چاہیے۔ ان کا دوسرا مشورہ یہ ہے کہ ہمارے شاعروں کو ہندی بھاشا کی طرف متوجہ ہو جانا چاہیے اور ہندی شاعروں کی طرح بے جا مبالغہ آرائی سے پرہیز کر کے اپنی شاعری میں جذبات کی سچی تصویر کھینچنی چاہیے۔ دوسرے یہ کہ ہمیں اپنی شاعری میں مقامی الفاظ، تشبیہوں اور استعاروں جیسے شعری وسائل کو بروئے کار لانا چاہیے تاکہ ہمارا پیغام شاعری کے ذریعے عوام تک آسانی سے سے پہنچ سکے۔ مولانا آزادؔ نے اردو شاعری کی اصلاح میں اہم رول ادا کیا اور اردو نظم کے فروغ میں اُن کا کارنامہ ناقابل فراموش ہے۔ اس سلسلے میں آزادؔ نے عملی ثبوت بھی دیے۔ ان کی نظم ''حبِ وطن'' سے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

الفت سے گرم سب کے دل سرد ہوں ہم
اور جو کہ ہم وطن ہوں وہ ہمدرد ہوں ہم

☆☆☆

لبریز جوشِ حبِ وطن سب کے جام ہوں
سرشارِ ذوق وشوق، دلِ خاص وعام ہو

محمد حسین آزاد کے بعد جو نام فوراً ذہن میں آتا ہے وہ الطاف حسین حالی کا ہے۔ حالی اردو ادب میں تنقید اور سوانح نگاری کے بنیاد گزار ہیں۔ انہوں نے اچھی شاعری بھی کی لیکن شاعر اور سوانح نگار سے زیادہ وہ بطور ایک نقاد زیادہ مشہور ہیں۔ حالی نے قصیدہ بھی کہے اور غزلیں اور نظمیں بھی۔ حالی کی شاعری میں ہمیں سادگی ملتی ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں بے جا تکلف اور مبالغہ آرائی سے پرہیز کیا۔ زندگی کے سیدھے سادے تجربات کو اپنی غزلوں اور نظموں میں جگہ دی۔

1857 کے غدر کے وقت حالی کی عمر تقریباً بیس برس کی تھی۔ یہ انحطاط اور تیزی سے بدلتی ہوئی فضا کا دور تھا۔ حالی نے اسی انحطاطی دور میں آنکھ کھولی۔ حالی ایک بیدار ذہن کے مالک تھے۔ بقول آل احمد سرور۔

> ''حالی چاہتے تو جذبات کی چلتی پھرتی تصویریں کھینچ سکتے تھے اور اسی میں خوش رہ سکتے تھے۔ مگر زندگی اور ماحول کے مطالعے سے انہیں فکرِ روشن عطا ہوئی تھی'' [۲]

قوم کی بگڑتی ہوئی حالت دیکھ کر انہیں کافی دُکھ ہوا۔ شاعری سے وہ اصلاح کا مطالبہ کرنے لگے۔ حالی نے جو غزلیں کہیں اُن میں انہوں نے ہمیشہ اپنی قوم کی اصلاح اور

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

سماجی مقصد کو پیش نظر رکھا۔ انہوں نے عموماً اپنی غزلوں میں سادہ زبان استعمال کی۔ قومی اور ملی مسائل پر حالیؔ نے طبع آزمائی کی۔ تمدنی اور تہذیبی حالات' اخلاقی اور معاشرتی مسائل کو انہوں نے اپنی شاعری میں بڑی دلچسپی سے پیش کیا۔

یا زمانہ ہی یارب گیا بدل　　　　ہوگئے ہیں ہم ہی کچھ اور آج کل
اور بھی ہونا ہے شاید مبتدل　　　　رہ گئے ہیں کچھ کچھ آثارِ سلف

تقلید قوم ہی پر گر ہے مدار تحسین
تو ہم نے دوستوں کی تحسین سے ہاتھ اُٹھایا

حالیؔ کی غزل کے متعلق فراق گورکھپوری ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"اردو ادب کی تاریخ میں حالیؔ پہلا شخص ہے جس نے غزل کو سماجی اور اجتماعی زندگی سے متعلق مسائل وخیالات کا آلۂ اظہار بنایا۔ دربار اور درباری ماحول، محض انفرادی زندگی وجذبات، جاگیردارانہ نظام کی فضا ونفسیات کو حالیؔ کی غزل الوداع کہہ رہی ہیں۔ حالیؔ ہندوستان اور اردو ادب کی تاریخ میں ایک درمیانی اور عبوری دور کا شاعر ہے۔[۳]

حالیؔ نے نظمیں بھی کہیں۔ ان میں "برکھارت"، "حب وطن"، "نشاطِ امید" اور "مُناظرہ رحم وانصاف" قابل ذکر ہیں۔ ان نظموں میں ہمیں واقعیت، منظر نگاری، اخلاقی شعور، سماجی احساس کارفرما نظر آتا ہے۔ حالیؔ کی مختلف نظموں سے چند اشعار ملاحظہ ہوں جن میں ہمیں ایک ترقی پسند رویہ نظر آتا ہے۔

اٹھو اہل وطن کے دوست بنو　　　　بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر　　نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر

(حب وطن)

ہم کہ غیروں کے سوا محکوم رہتے آئے ہیں　　قدر آزادی کی جتنی ہم کو ہو اتنی ہے کم

(آزادی کی قدر)

حالؔی نے اپنی تنقید میں اردو شاعری کی اصلاح پر پوری توجہ صرف کی۔ انہوں نے سب سے زیادہ زور اس بات پر دیا کہ ہمارے شعرا کو سب سے پہلے غزل کی اصلاح کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ اردو ادب میں یہ نئی بات تھی۔ اس سے پہلے شاید مشکل ہی سے کسی ادیب یا شاعر نے غزل کی اصلاح کی بات کی ہو۔ اس سلسلے میں حالؔی کا موقف یہ تھا کہ غزل چونکہ قوم میں مرغوب صنف ہے اس لیے اس کا اثر قومی مذاق اور اخلاق پر یقینی ہے۔ اس کے علاوہ حالؔی نے اپنی تنقید میں جن چیزوں پر زور دیا ان کو مختصراً اس طرح پیش کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ تین چیزوں کے بغیر شاعری میں کمال حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ہیں تخیل، مطالعۂ کائنات اور تفحص الفاظ۔

2- تین خوبیاں جو دنیا کے بہترین شاعروں کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ سادگی، جوش اور اصلیت۔

3- شاعری زندگی کو بہتر بنانے میں مددگار ہو سکتی ہے اور اخلاق کی اصلاح کا شاعری سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں۔

4- سیاسی معاملات میں شاعری ہماری مدد کر سکتی ہے۔

5- بری شاعری سے لٹریچر، زبان اور سماج کو نقصان پہنچتا ہے۔ اس سے پرہیز کرنا چاہیے۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

-6 شاعری میں تقلید سے پرہیز کرنا چاہیے اور اپنی شاعری میں نئے نئے مضامین باندھنے چاہیے۔

حالؔی ترقی پسند خیالات رکھنے والے آدمی تھے اور شاعری کے بارے میں ان کے یہ خیالات بالکل نئے تھے۔ اس لیے ان کی مخالفت بھی ہوئی۔ شاعر اور ادیب لکیر کے فقیر بن بیٹھنے ہی میں خوش تھے۔ نئے خیالات کو قبول کرنا آسان نہیں تھا۔ لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا حالات بدلتے گئے اور حالؔی کے کارناموں کی قدر ہونے لگی اور پھر ایک کارواں سا سامنے آیا جس نے ادب میں نئے نئے موضوعات کو جگہ دی اور یوں اردو ادب ایک نئے دھارے پر چل نکلا۔ حالؔی اور آزادؔ کے بعد اردو کے پہلے ناول نگار نذیر احمد کا نام ذہن میں آتا ہے۔ نذیر احمد بھی سرسید تحریک سے متاثر تھے۔ انہوں نے اصلاحی جذبے کے تحت ناول لکھے۔ حقیقت نگاری ان کے ناولوں کی ایک اہم خوبی ہے۔ نذیر احمد کے ناولوں میں ہمیں اس وقت کے سماج کی حقیقی تصویریں نظر آتی ہیں۔ مسلم گھرانوں کی انہوں نے حقیقت شعارانہ عکاسی کی ہے۔ نذیر احمد کا مقصد انسان اور سماج کو بہتر بنانا ہے۔ انہوں نے اپنے ناولوں ''مراۃ العروس''، ''بنعات النعش''، ''توبۃ النصوح''، ''فسانۂ مُبتلا''، ''ابن الوقت''، ''ایامیٰ''، ''رویائے صادقہ'' میں سماج کی بڑی حقیقی تصویریں پیش کیں اور سماجی اصلاح پر زور دیا۔

سرسید اور ان کے رفقاء کے بعد بہت سے نئے ادیبوں اور شاعروں نے اردو ادب میں ترقی پسند خیالات کو جگہ دی اور ادب میں نئے نئے موضوعات داخل کیے۔ حب الوطنی، آزادی اور انقلاب پر نظمیں کہی جانے لگیں۔ غریبوں اور مزدوروں کی حمایت میں ادب تخلیق ہونے لگا اور یوں اردو ادب نئے تجربات اور انداز سے آشنا ہو رہا تھا۔ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں اردو ادب میں جن ادیبوں اور شاعروں نے

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

نئے نئے موضوعات کو جگہ دی ان میں پریم چند، اقبالؔ، چکبستؔ، حسرتؔ موہانی، جوشؔ ملیح آبادی، فیض احمد فیضؔ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

پریم چند نے جب لکھنا شروع کیا اُس وقت ملک سیاسی اور سماجی بحران میں مبتلا تھا۔ ایک طرف بنگال کی تقسیم سے ملک میں شورش پھیل رہی تھی تو وہیں دوسری طرف کانگریس کے اندر 'گرم دل' کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ ہر طرف آزادی کے راگ گائے جا رہے تھے۔ پریم چند ان واقعات سے بہت متاثر ہوئے اور ان ہی واقعات سے متاثر ہو کر ''سوز وطن'' کے افسانے لکھے۔ پریم چند ابتدا ہی سے ترقی پسند خیالات رکھتے تھے۔ انہوں نے ہمیشہ فن کی افادیت پر زور دیا اور ہمیشہ ادب برائے زندگی کے اصولوں پر کاربند رہے۔ حب وطن ان کے دل میں ابتداء ہی سے جاگزیں تھا۔ اپنے افسانوی مجموعے ''سوز وطن'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

> ''ہر قوم کا علم و ادب اپنے زمانے کی سچی تصویر ہوتا ہے...... اب ہندوستان کے قومی خیال نے بلوغیت کے زینے پر ایک قدم اور بڑھایا ہے اور حب وطن کے جذبات لوگوں کے دلوں میں سر ابھارنے لگے ہیں۔ کیونکر ممکن تھا کہ اس کا اثر ادب پر نہ پڑتا۔ یہ چند کہانیاں اس اثر کا آغاز ہیں اور یقین ہے کہ جیوں جیوں ہمارے خیال رفیع ہوتے جائیں گے، اس رنگ کے لٹریچر کو روز افزوں فروغ ہوتا جائے گا۔ ہمارے ملک کو ایسی کتابوں کی اشد ضرورت ہے جو نئی نسل کے جگر پر حب وطن کی عظمت کا نقشہ جمائیں۔''[۴]

''سوز وطن'' میں پانچ افسانے دنیا کا سب سے انمول رتن، شیخ مخمور، یہی میرا وطن ہے، صلۂ ماتم، عشق دنیا اور حب وطن شامل ہیں۔ اگر چہ ان افسانوں کی فضا داستانوی ہے

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

لیکن یہ کہانیاں جدید مقاصد کے تحت لکھی گئی تھیں۔ مصنف ان کے ذریعے قوم کے اندر غیرت، حمیت اور بہادری کے جذبات کو ابھارنا چاہتا تھا۔ "سوزوطن" کے افسانوں کے بعد پریم چند نے 1909ء سے 1920ء تک کچھ تاریخی اور اصلاحی افسانے لکھے۔ رانی سارندھا(1910ء)، راجا ہردول (1911ء)، آلہا(1912ء) اور گناہ کا آگن کنڈ، اسی زمانے میں لکھے گئے۔ یہ افسانے لکھ کر پریم چند نے ہندوستان کی گزشتہ عظمت اور کارناموں سے قوم کو روشناس کیا اور عوام کے اندر حب وطن کے جذبات کو اُبھارا۔

1920ء سے 1936ء تک پریم چند نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں سیاسی اور سماجی مسائل کو بڑی فنکارانہ چابکدستی کے ساتھ پیش کیا۔ 1921ء میں انہوں نے سرکاری ملازمت سے سبکدوشی اختیار کی اور پوری طرح اپنے آپ کو قوم کی خدمت کے لیے وقف کردیا۔ پریم چند نے ایک ترقی پسند نقطۂ نظر کے تحت اپنے افسانوں میں سماج کی عام بُرائیوں کے خلاف آواز اُٹھائی۔ غریبوں، مزدوروں اور عورتوں کے مسائل کو انہوں نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں پیش کیا۔ جیل بھاڑے کا ٹٹو، قاتل، ستیہ گرہ، نجات، سوتیلی ماں، بیٹی کا دھن، نوک جھونک، معصوم بچہ، بدنصیب ماں، کفن وغیرہ افسانوں اور ہم خرماں وہم ثواب، روٹھی رانی، جلوۂ ایثار، بیوہ، نرملا، غبن، میدان عمل وغیرہ ناولوں میں انہوں نے بڑی ہنرمندی کے ساتھ عورتوں خصوصاً بیوہ عورتوں کے مسائل، غریبوں اور مزدوروں کے استحصال کو موضوع بنایا۔

1917ء کے روسی انقلاب اور پہلی عالمی جنگ نے اردو ادب خصوصاً شاعری کو بہت متاثر کیا۔ شعرا کے اندر دبی آزادی کی جو چنگاری تھی اس نے اب شعلوں کی شکل اختیار کی۔ اب وہ اپنے لب ولہجہ میں پوری طرح بے باک نظر آتے ہیں۔ اقبالؔ، چکبستؔ، محمد علی جوہرؔ، حسرتؔ موہانی، جوشؔ ملیح آبادی وغیرہ نے کھل کر آزادی کی حمایت میں نظمیں لکھیں۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

اقبالؔ نے جہاں غریبوں اور مزدوروں کو جگانے کی بات کی وہیں انہوں نے مغربی جمہوری نظام کا پردہ بھی فاش کیا۔ چکبستؔ نے حب وطن کے جذبے کے تحت کافی کامیاب نظمیں لکھیں۔ بقول احتشام حسین۔

> ''چکبست نے اپنی شاعری میں قومی جوش وخروش، حب الوطنی، اظہار خیال کی آزادی کا مطالبہ اور معاشرتی اصلاح کو ایک بہترین سانچے میں پیش کیا۔''[5]

> ''محمد علی جوہرؔ نے اپنی غزلوں میں سیاسی مسائل سے پیدا شدہ کیفیات کو پیش کیا۔ حسرت وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اشتراکی اصولوں کی اہمیت سمجھی۔ انہوں نے قومی تحریک کو مغرب دشمن اور ایشائی نجات کی تحریک میں بدلنے کی پوری کوشش کی۔[6]

جوشؔ نے اپنی شاعری میں سیاسی انقلاب کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا اور انقلابی شاعری کو ایک مستقل رجحان کی شکل دی۔ جوشؔ نے اپنی شاعری میں اشتراکیت کے زیر اثر مزدوروں اور کسانوں میں بیداری پیدا کرنا چاہی۔

1932ء میں اردو افسانوں پر مشتمل ایک مجموعہ ''انگارے'' شائع ہوا۔ یہ مجموعہ نوافسانوں اور ایک ڈرامے پر مشتمل تھا۔ ''انگارے'' کے لکھنے والوں میں سجاد ظہیر، احمد علی، رشید جہاں اور محمود الظفر شامل تھے۔ خالد علوی کے لفظوں میں یہ تمام نوجوان ادیب مذہبی انتہا پسندوں سے اکتائے ہوئے اور جذباتی طور پر انقلابی تصورات لیے ہوئے تھے۔ چنانچہ ان کی کہانیوں میں انقلابی اور باغیانہ خیالات کا عکس صاف نظر آتا ہے۔ بقول خلیل الرحمٰن اعظمی۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

"ان کہانیوں میں انقلابی اور باغیانہ خیالات ایک طوفان کی طرح سے پھٹ پڑے تھے۔ ان لکھنے والوں میں جوانی کا جوش، اعتدال وتوازن کی کمی اور شوخی وسرکشی تھی جو اس وقت نوجوان طالب علموں میں عام تھی۔ اس لیے مروجہ اخلاق اور مذہبی عقائد پر طنز واستہزا کا رنگ ان کہانیوں میں بہت شوخ ہو گیا تھا۔ اس کتاب کی اشاعت نے پُرانے خیال کے لوگوں میں بڑی برہمی پیدا کی اور اس کے خلاف اس قدر احتجاج کیا گیا کہ حکومت نے اس مجموعے کو ضبط کرلیا۔ لیکن اس مجموعے کی اشاعت اس بات کی خبر دیتی تھی کہ ہندوستانی نوجوانوں میں ذہنی اور جذباتی طور پر کچھ ایسی تبدیلیاں ہورہی ہیں جن سے ہمارے ادب کو جلد ہی دوچار ہونا ہے۔" [۷]

اُوپر کے تجزیے سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ غدر کے بعد اردو ادب میں جو رجحان سامنے آیا اور جس میں سرسید، حالؔی، آزادؔ اور نذیر احمد وغیرہ برابر کے شریک تھے اپنے اندر جدید ترقی پسندی کی ابتدائی علامتیں رکھتے تھے۔ بقول احتشام حسین ان ادیبوں کے یہاں قدیم روایتی ادب کے مقابلہ میں ترقی پسندی کی علامتیں برابر ملتی ہیں۔ اور جن موضوعات کے تحت ان ادیبوں نے اپنے فن کو ڈھالا اس وقت ترقی پسندی کی یہی علامتیں ہوسکتی تھیں۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

حواشی:

۱۔ فراق گورکھپوری، اندازے (الہ آباد، ہندوستانی پبلشنگ ہاؤس، 1944ء) ص 217

۲۔ آل احمد سرور، تنقید کیا ہے (نئی دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، 2004ء) ص 16

۳۔ فراق گورکھپوری، اندازے، ص 281

۴۔ پریم چند 'سوز وطن' (الہ آباد، تہذیب نو پبلی کیشنز، 1980ء) 17

۵۔ احتشام حسین، تنقیدی جائزے (لکھنؤ، ادارۂ احباب پبلیشرز، 1956ء) ص 211

۶۔ اسلام بیگ چنگیزی، ایشائی بیداری اور اردو شعرا'، (الہ آباد، ادارۂ انیس ارد، 1961ء

۷۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک (علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، 2007ء) 27

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

اردواور گوجری زبان کالسانی رشتہ

نسل انسان کا ارتقاء جب سے شروع ہوا تو زبان کا ارتقا بھی لازمی بات ہے۔ وہاں سے شروع ہوا ہو۔ حضرت آدم نسل انسانی کے جد امجد ہیں اور تمام دنیا ان کی اولاد ہے۔ لہذا تمام زبانیں بھی ان کی زبان سے پھوٹتی ہیں۔ برصغیر ہندو پاک کو سیکڑوں زبانوں اور بولیوں کی وجہ سے زبانوں کا گھر کہا جاتا ہے۔ ان زبانوں اور بولیوں کو کسی حد تک جغرافیائی حد بندیوں اور دور قدیم میں رسل و رسائل اور حمل و نقل کے ذرایع کے فقدان کا نتیجہ کہہ سکتے ہیں۔ لیکن دور جدید جسے سائنس کا دور کہتے ہیں، میں سائنسی ایجادات و اختراعات کی بدولت یہ فاصلے گھٹ گئے ہیں اور آج پوری دنیا ایک علمی گاؤں میں سمٹ کر رہ گئی ہے۔ ایسے گاؤں کو ظاہر ہے ایک ایسی زبان کی ضرورت ہے جو ذریعہ افہام ہو اور یہ زبان انگریزی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اگر یہ بھی کہا جائے کہ اردو زبان جسے صرف برصغیر ہندو پاک کی زبان سمجھا جاتا تھا آج دنیا کے کونے کونے میں اپنی بستیاں بسائے ہوئے ہے تو غلط نہ ہوگا۔ اردو زبان کی پیدائش اور اس کے مولد کے بارے میں متعدد نظریات پیش کئے گئے جن کا اظہار کرنا بے محل ہے لیکن اب یہ بات مزید محتاج تحقیق نہیں رہی کہ اردو جو جدید آریائی زبان ہے جس کا مولد و منشا دہلی اور دوآب گنگ و

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

جمن ہے۔ بہر حال میرا روئے سخن اردو اور گوجری زبان کا لسانی رشتہ ہے تو براہ راست اپنے موضوع کی طرف چلتا ہوں۔

گوجری زبان جو ہندوستان کی قدیم زبانوں میں سے ایک ہے نہ صرف برصغیر ہندو پاک میں بلکہ افغانستان، وسط ایشائی ریاستوں سے ہو کر شمالی اور جنوبی یورپ تک بولی جاتی ہے۔ ہندوستان میں گوجری زبان کے تاریخی شواہد پانچویں صدی عیسوی کے بعد ہی ملتے ہیں اور پھر تیرہویں صدی عیسوی تک ہندوستان میں گوجر حکومتوں کے واضح ثبوت دیکھنے میں آتے ہیں۔ مولوی عبدالمالک مرحوم نے اپنی کتاب ''شاہان گوجر'' میں لکھا ہے ''گوجر قوم کا تعلق آریاء نسل سے تھا مگر ہندوستان میں آنے کا زمانہ یقین کرنا مشکل ہے'' وہ مزید اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ پہلی صدی تا پانچویں ق م ہوسکتی ہے۔ ایک اور مقام پر انہوں نے لکھا ہے کہ گوجر وسط ایشیا سے آئے لکھتے ہیں کہ ''وسط ایشیا میں خانہ بدوشوں کے درمیان جنگ ہوئی یہ جنگ مہینوں جاری رہی۔ گوجر قوم بحرہ خذر کے ساتھ ساتھ آباد تھی یہ بحرہ خذر سے ہجرت کر کے ہندوکش کے دشوار گزار پہاڑوں کو عبور کر کے کابل، پنجاب، کشمیر اور ہزارہ میں آباد ہوئے۔ اس کے بعد گوجروں کے ہجرت کا سلسلہ جاری رہا۔'' اس طرح کے بے شمار نظریات موجود ہیں جن کو یہاں بیان کرنے کی گنجائش نہیں۔ لیکن یقیناً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس دور میں گوجری عالمگیری زبان رہی ہوگی اور اسی زبان کو سرپرستی بھی رہی ہوگی۔ اس دور میں ادیبوں اور شاعروں نے کافی مقدار میں گوجری ادب تخلیق کیا جس میں شعری ادب زیادہ ہے اور وہ بھی اکثر صوفیانہ کلام ہے۔ ان شعراء میں سید نورالدین ست گرو، حضرت امیر خسرو، شاہ میراں جی، شاہ باجن، شاہ علی جیوگامی، برہان الدین جانم، خوب محمد چشتی اور امین گجراتی کے نام قابل ذکر ہیں جن کے گوجری کلام کو آگے پیش کیا جائے گا۔ گوجری زبان کو ہندوستان میں خاص کر گجرات میں مرکزی حیثیت

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

حاصل رہی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اپنی ''تاریخ اردو ادب'' میں لکھتے ہیں ''جب دکن میں اردو کے نئے مراکز اُبھرے تو وہاں کے اہل علم ادب نے قدرتی طور پر گوجری ادب کی روایت کو اپنایا۔ دکن میں جب اردو کا چرچا ہوا اور اسے سرکاری دربار کی سرپرستی حاصل ہوئی تو وہاں کے ادیبوں اور شاعروں کی نظر گوجری ادب پر ہی گئی اس ادب کو معیار تسلیم کر کے انہوں نے اس ادب کے تمام عناصر کو اپنے ادب میں جذب کر لیا۔'' ڈاکٹر جمیل جالبی سترہویں صدی تک گوجری زبان کی ادبی حیثیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اردو بولنے والوں کو گوجری سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی کیونکہ گوجری زبان اور اردو کا لسانی رشتہ بہت قریبی ہے بلکہ یہ کہا جائے تو کوئی مغالطہ نہیں ہوگا کہ اردو زبان کی بنیادیں ہی گوجری ادب پر ہیں۔

برصغیر ہندو پاک کی یہ زبانیں گوجری زبان سے بہت متاثر ہیں مثلاً پنجابی، سندھی، مارواڑی، میواتی، گجراتی، جودھپوری، برج بھاشا، دکنی اور کھڑی بولیاں وغیرہ۔ ڈاکٹر غلام حسین اظہر ایک مضمون رقمطراز ہیں:

> ''گوجری زبان کی گرائمر بہت اہم حقائق کی نشاندہی کرتی ہے۔ اس کے مطالعے سے جو حقیقت سامنے آتی ہے وہ اس زبان کی وسعت اور مختلف زبانوں سے اس کی گہری مماثلت ہے۔ مثلاً برج بھاشا، راجستھانی، میواتی اور سندھی سے یہ زبان کئی لحاظ سے مماثل ہے۔''[1]

ڈاکٹر جمیل جالبی ''تاریخ ادب اردو'' میں ایک اور مقام پر یوں رقمطراز ہیں:

> ''اسی زبان کا ایک روپ ہمیں گجرات میں ملتا ہے جسے ''گجری'' یا بولئ گجرات'' کا نام دیا جاتا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جب گوجر قوم فاتح کی حیثیت سے ہندوستان میں داخل ہوئی تو اس نے اپنے

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

جنوبی مقبوضات کے تین حصے کیئے۔ سب سے بڑے حصے کا نام
مہاراٹھ، دوسرے کا گوجر راٹھ اور تیسرے کا سوراٹھ رکھا۔ ہندوستان
کے ترک فاتحوں نے گوجر راٹھ ان کی زبان سے ادا ہونا مشکل تھا،
گجرات بنا دیا۔ براعظم کے مغرب اور مکران وسندھ کے نیچے، خلیج
کچھ سے ملحق علاقہ آج بھی ترک فاتحوں کے اسی نام ''گجرات'' سے
موسوم ہے۔''[۲]

حافظ محمود شیرانی جنہوں نے صوفیائے کرام اور شعراء کے گم گشتہ کلام کو بڑی جانفشانی سے منظرِ عام پر لایا۔ گوجری زبان کے متعلق یہ کہا:

''گوجری سے مراد مسلمانانِ گجرات کی اردو ہے۔ گوجری یا گجری
کی اصطلاح دیر تک استعمال ہوتی رہی ہے۔ حتیٰ کہ بارہویں صدی
ہجری کی ابتداء میں بھی اس کا رواج پایا جاتا ہے۔''[۳]

یورپین ماہر لسانیات جارج گریئرسن کے مطابق:

''گوجر معمولی حکمران نہ تھے بلکہ ایک وہ ایک عام زبان بولتے تھے
جو لینگو افرانکا کی حیثیت سے ملک میں رائج تھی۔ جو ان کے زیر
حکومت تھا۔ ان کی یہ زبان ایک الگ حیثیت کی حامل تھی جس کو
''گوجری'' کہتے تھے جو مختلف مقامات پر ذرا سے مختلف لہجے میں
بولی جاتی تھی۔''[۴]

متذکرہ حوالاجات کے علاوہ دیگر حوالے بھی تواریخ کی کتب میں موجود ہیں لیکن اس مختصر مقالے میں تفصیلاً احاطہ کرنا مشکل ہے۔ ان حوالاجات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ گوجری زبان برصغیر ہندوپاک کے ہر خطے میں تھوڑے بہت لہجے کیفرق کے ساتھ باقاعدہ

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

طور پر عوامی اور سرکاری زبان رہی ہے۔ جس وقت گوجری زبان نے اپنی مرکزیت کھودی تو یہ زبان مقامی لہجوں میں تقسیم ہو گئے اور گوجری زبان کی ادبی بنیادوں پر دوسری زبانوں کے ڈھانچے تعمیر ہونا شروع ہو گئے۔ کہیں گجراتی کہیں راجستھانی، کہیں ہریانوی، کہیں سندھی، کہیں پنجابی اور کہیں ہندوستانی کا نام دے کر اردو اور ہندوی زبانوں نیبھی اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔

جموں و کشمیر میں گوجر چونکہ مذہب اسلام کو ماننے والے ہیں اس لئے جموں و کشمیر میں بولی جانے والی گوجری زبان پر عربی اور فارسی کے واضح اثرات دیکھنے میں آتے ہیں۔ جموں و کشمیر میں کئی معروف بولیاں رائج ہیں لیکن آٹھ معروف اور اہم زبانوں یعنی کشمیری، پہاڑی، ڈوگری، بلتی، دردی، پنجابی، لداخی اور گوجری کو جموں و کشمیر کا آئینی تحفظ حاصل ہے۔ گوجری زبان و ادب کی ترقی و ترویج کے لئے قائم ''اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز'' میں پہاڑی اور گوجری کے لئے ایک ساتھ شعبہ قائم کیا گیا ہے یہاں ان زبانوں میں مختلف موضوعات پر سالانا بیسوں کتب شائع ہوتی ہیں۔

The undying spirit کے فاضل مصنف میجر جنرل (ریٹائرڈ) طارق نظامی نے کشمیر کی معروف زبانوں کی فہرست یوں کی ہے:

> "The main language are sena, balti, ladakhi and tibetan in north and kashmiri, punjabi, dogri, pahari, hindko, and gojri, in the rest of the state." 5

گوجری زبان و ادب اور اس کے قبیلے کی نشاندہی کرتے ہوئے عبدالباقی نسیم اپنے ایک مضمون ''گوجر اور گوجری زبان'' (دیباچہ سانجھو کھلاڑو) میں رقمطراز ہیں :

''گوجری زبان و ادب اس بدنصیب اور خود فراموش گوجر قوم کا ورثہ

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

ہے جو برصغیر کی ایک قدیم ترین اور عظیم ترین قوم ہے۔اس قوم کے
بادشاہوں راجوں مہاراجوں اور سلاطین و وزراء نے صدیوں نہیں
بلکہ ہزاروں سال تک دنیا کے وسیع خطوں اور براعظموں پر حکومت
کی ہے۔''[6]

جموں و کشمیر میں بولے جانے والی گوجری یا پھر قدیم گوجری کا یہاں تک اردو زبان سے تعلق ہے تو اصولِ قواعد کے مطابق گوجری اور اردو کے لسانی رشتے کی گہرائی اور اشتراکیت بہت مماثل ہے۔ان کی صرفی نحوی تراکیب، فعلی مادوں، مصادر، فعلی تراکیبوں، کلمات استفہامیہ، کلمات اشارات، کلمات زمانی، شخصی ضمائر، اعداد توصیفی محاورات، ضرب الامثال، کہاوتیں ذخیرہ الفاظ، تراکیب و بندش، جملوں کی ساخت لہجے اور روایات، تلمیحات واشارات اور طرزِ فکر واحساس دونوں زبانوں میں مشترک ہیں۔مثال کے طور گوجری زبان کے نمونے دیکھیے جس نے بعد میں اردو کا نام حاصل کیا اور یہ ہی اردو زبان کی بنیاد بھی ہے۔

یوسوارتھ کو جیوڑو سوارتھ چھوڑ نہ جائے
جب گوبند کی کرپا کری مارو منو دسمجھیو آئے [7]

جیوکسو نہ بھلی دھن پنو کا سونہ اٹھو
دونی دی اوسری وادی تن سوان گنائی ڈٹھو [8]

در دروازے جاءِ کے کیہو ڈٹھو گھڑیال
ایہہ ندوسا ماریئے، ہم دوساں دا کیا حال؟ [9]

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

بار پرائے بیسنا سائیں مجھے نہ دیہہ

جے توں ایویں اکھسی ، جیو سریروں لیہہ ۱۰؎

تنہاں مکھ ڈراونے جنہاں وساریو ناؤں

ایتھے دکھ گھنیرے آگے ٹھور نہ ٹھاؤں ۱۱؎

پچھلی رات نہ جاگیو جیوندڑو مویوں

جے تیں رب وساریا رب نہ وسریوں ۱۲؎

مذکورہ بالا اشعار تیرھویں صدی کے ہیں جو قدیم اردو کے نمونے ہیں لیکن ان اشعار کا اگر آج کی گوجری سے موازنہ کیا جائے تو کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا۔ مثلاً بیسنا (بیٹھنا)، ٹھور (تھوڑا)، جنہاں (جن کو)، تنہاں (ان کو)، میرو (میرا)، کیہو ڈٹھو (کیا دیکھا) اور پھر آخری شعر تو پورا آج کی گوجری زبان پر مشتمل ہے جس میں جاگیو (جاگا)، جیوندڑو (زندہ)، تیں (تم نے)، وساریا (بھول جانا)، نہ وسریو (نہیں بھولا) وغیرہ الفاظ آج بھی گوجری زبان کا سرمایہ ہیں۔

امیر خسرو کے کلام کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو جابجا گوجری کلام کا سامنا ہوگا:

ایسو پیر پایو نظام الدین اولیاء

عرب یار تیرو بسنت منایو ۱۳؎

اس شعر میں ایسو (ایسا)، پایو (پانا) تیرو (تیرا)، منایو (منایا) وغیرہ خالص گوجری زبان کے الفاظ ہیں۔

حضرت بندہ نواز گیسو دراز کا رسالہ معراج العاشقین جیسے ماہرین لسانیات نے اردو کی ابتدائی نثر مانا ہے کی ایک مختصر عبارت نمونے کے طور پر پیش ہے:

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

''ایک تن کوں پانچ دروازے ہیں۔ ہور پانچ دربان ہیں۔ پَیلا تن
واجب الوجود، مقام اس کا شیطانی۔'' ۱۴

اس عبارت میں تن (جسم)، ہور (اور)، پَیلا (پہلا) جیسے الفاظ گوجری کا ثبوت ہیں جن کا مطالعہ کرنے کے بعد ڈاکٹر جمیل جالبی نے کہا:

''یہ گجری اردو کی بنیادی خصوصیت رہی ہے کہ اس نے دیسی الفاظ کو
کثرت سے اپنے دامن میں جگہ دی ہے۔ سارے قدیم گجری شعراء
اسی زبان و بیان کے ترجمان ہیں۔'' ۱۵

مشترکہ زبان گوجری اور اردو کے باہمی اشتراک کو اگر قواعد یعنی علم ہجا، علم صرف اور علم نحو کے ترازوں میں تولا جائے تو بے شمار مثالیں مل جاتی ہیں۔ مثلاً:

لفظ موضوع:

اردو	گوجری
کھانا	کھانا/کھانو
عبادت	عبادت
نیک	نیک
مکان	مکان
دکان	دکان

کلمہ/ جملہ:

اردو	گوجری
قران مجید اللہ کی کتب ہے	قران اللہ کی کتاب ہے
ہر مسلمان پر نماز فرض ہے	ہر مسلمان پر نماز فرض ہے

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

خدا پر بھروسہ رکھو	خدا پر بھرسو رکھو
تم نے کبوتر اڑایا	تم نے کبوتر اڑ ایو/ اڈایو
وہ آتی رہے گی	وہ آتی رہے گی۔۔۔وغیرہ

اردو، آخر میں (ا) آتا ہے جبکہ گوجری میں (و)، جمع کی صورت میں (ا) آخر میں آتا ہے جبکہ اردو میں (ین، ئے) وغیرہ آتے ہیں مثلاً:

اردو	گوجری
میں اسکول جاؤں گا	ہوں اسکول جاؤں گو
وہ کہاں گئے ہیں	ویہہ کیاں گیا ہیں
وہ آتا رہے گا	وہ آتو رہے گو
ہم آتے رہیں گے	ہم آتا رہاں گا
وہ روئے گا	وہ روئے گو

اردو میں ''ہوں'' کوئی الگ ضمیر نہیں جبکہ گوجری میں ''ہوں'' (میں) ایک ضمیر ہے جو واحد مونث یا مذکر متکلم کو ظاہر کرتی ہے مثلاً:

اردو	گوجری
میں رو رہی ہوں	ہوں رو رہی ہوں
میں پکڑوں	ہوں پکڑوں
میں گئی ہوں	ہوں گئی ہوں

اب تک تو قدیم اردو اور گوجری کے اشتراک کے ثبوت پیش کئے گے جو کافی حد تک لازم و ملزدم ہیں۔ جموں و کشمیر میں بولی جانے والی گوجری زبان کے گوجری شعرا کے کلام کو بھی نمونے کے طور پر پیش کرنا ضروری ہے تا کہ اندازہ ہو سکے کے کس قدر گوجری

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

زبان اور اردو میں مماثلت ہے:

خیراں نال رب اپنو دیس دسے پورو ہوئے ارمان تمام میرو
ذبیع پونچھ، کشمیر رو جور، جموں سارا دیس ناں ہوئے سلام میرو ١٦

س۔ سال کئی گزر یا بچھڑیاں ناں گزر گئی اک عمر تنہائیاں ماں
حائل ہوئی بچکار دیوار پہڑی انگا اونگا کا سجناں پہیایاں ماں ١٧

ڈاکٹر صابر آفاقی جنہوں نے گوجری زبان وادب کی آبیاری میں کافی محنت کی۔

حمد کا ایک نمونہ "پیغامِ انقلاب" سے:

نیلو فرش بچھایو، رب نے تنبو اُچو لایو، رب نے
سارو جگ لشکایو، رب نے لاٹو ایک جلایو رب نے
فر اس ماں انسان بنایو
رونق کو سامان بنایو

ایک نظم سے ایک بند:

اپنو آپ سیان رے پہائی خود ناں ہن پچھان رے پہائی
سچا رب ناں جان رے پہائی یو ای کہے قرآن رے پہائی
اپنی ذات نظارہ دیہے
فطرت کا لشکارا دیہے (١٨)

میاں نظام الدین لاروی جو بہت بڑے صوفی تھے۔ ان کلے گوجری کلام سے
ایک شعر ملاحظہ ہو:

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

اٹھرواں نا پچھے کوئی دسو کتوں آویں تم
کڈھ کے رَت کلیجہ بچوں پانی کیوں بنا نویں تم

محمداسرائیل اثر:

چھپا رکھیو تھو آج تک راز الفت میں زمانہ تیں
توں بُلبُل کس تیں سن آئی اثر کا دل کو افسانو (۱۹)

متذکرہ بالا قدیم اردو کلام اور گوجری کلام کے درمیان بحث سے ان کا آپسی رشتہ تلاش کرنا مشکل نہیں، چونکہ دونوں زبانوں کی صوتیات ایک جیسی ہیں اور بغور مطالعہ سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ گوجری صوتیات بہت قدیم ہیں جبکہ اردو زبان جدید ہے۔ مجموعی طور پر یہ کہ اردو کے شانہ بہ شانہ آج کی گوجری زبان میں بھی تمام اصناف سخن موجود ہیں۔ جن کے مطالعے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ گوجری زبان شعرونثر دونوں میں بہت زرخیز ہیا ور اردو اور گوجری کے لسانی رشتے میں جتنی گہرائی ہے اس کو مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ اس مقالے کا اختتام گوجری شاعر محمد اسرائیل مہجور کے ان اشعار سے کرتا ہوں:

بولی گوجری ہن کا گوجراں کی رہی نہیں ہُن جنہاں کی شان پہلی
انہاں گلاں ناں کدو یہہ لوک سمجھیں نہیں جنہاں کی جان پہچان پہلی
پتو کسے بھی گل کو لگے تاہیں دیکھے جد تاریخ انسان پہلی
رہیا جگ تیں اج مہجور پچھے پہلا لوک تے نالے زبان پہلی
چنگی ہووے نہ جد تک ماں کوئی پُتر ہووے نہ نیک نہاد پیدا
گوجری جہی زبان کہڑی اردو اس کی ہوئی اولاد پیدا ۲۰

ترجمہ: آج کے گوجروں کی زبان گوجری ہے لیکن اب اس کی پہلے والی شان نہیں رہی اور اس کو وہ لوگ نہیں سمجھتے جو اس کو نہیں پہچانتے۔ پرانی باتوں کا پتا چلتا ہے جب قدیم

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

تاریخ کا مطالعہ کیا جائے آج وہ لوگ بہت پیچھے رہ گے ہیں جن کی یہ زبان تھی۔جس بیٹے کی ماں اچھی ہوتی ہے اس کا بیٹا بھی اچھا ہوتا ہے۔ گوجری جیسی زبان کوئی نہیں،اردو اسی زبان کی اولاد ہے۔

حواشی

ا۔ اظہر غلام حسین: گوجری اور اردو۔ گوجری گرائمر کی روشنی میں،ص283۔

2۔ جالبی،جمیل ڈاکٹر: تاریخ اردو ادب جلد اول، ص89۔

3۔ مقالات حافظ شیرانی جلد اول مرتبہ مظہر محمد شیرانی ص282۔

4. G.A Grierson, the linguistic survey of india Vol-1 p-10

5. Nizami Tariq, Gen.(R), Undying Spirit P. 6

6۔ مقالات حافظ محمود شیرانی جلد اول مرتبہ مظہر محمود شیرانی، ص283۔

7۔ مسعود حسین خان ڈاکٹر،مقدمہ تاریخ زبان اردو، ص69،70۔

8۔ ،9،10،11،12۔ بابر علی سید، مرتبہ کلام بابا فرید،ص 5،23،38،55۔

13۔ نیاز احمد بسم اللہ،اردو گیت،ص134۔

14۔ مولوی عبدالحق ڈاکٹر، اردو کی ابتدائی نشونما میں صوفیا کرام کا کام،ص62۔

15۔ جمیل جالبی ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو حصہ اول،ص423۔

16۔ ذبیح،محمد اسماعیل،انتظار،ص49۔

17۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص90۔

18۔ آفاقی صابر ڈاکٹر،پیغام انقلاب،ص28،42۔

19۔ آفاقی،صابر ڈاکٹر،گوجری ادب،ص22،24۔

20۔ راجوری،مہجور؟ محمد اسرائیل،نغمہ کہسار، ص 73

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

جموں و کشمیر میں اردو زبان کے ابتدائی نقوش

کشمیر اپنے قدرتی حسن، رعنائی اور فطرت کی جادوگری کی بدولت سارے عالم میں مشہور ہی نہیں بلکہ منفرد مقام و مرتبہ بھی رکھتا ہے۔ ماضی میں اور آج بھی یہ رشکِ بریں خطہ اپنوں اور فرنگیوں سبھی کے لیے باعثِ کشش ہے۔ جس نے بھی اس خلد عرضی میں قدم رکھا اس نے اس کی بو اور مسحور کن صورت حال کو قبائے سخن پہنا کر پیش کیا۔ اس قول میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ یہ زمین سخن وروں کے لئے ایک محبوب موضوع رہی ہے۔ جس نے کئی فلسفوں کو اپنی آغوش میں پروان چڑھا کر دُنیا کو اخوت، محبت اور باہمی شفقت کا درس دیا ہے، شاعروں، ادیبوں اور سیاحوں کی زبان میں کشمیر کو فردوس بریں، خلدِ ارضی، گل پوش وادی، وادی جناں اور جنتِ بے نظیر بھی کہا گیا۔

کشمیر کی مدح سرائی کا سلسلہ دراصل اُس وقت سے شروع ہوا جب ریاست جموں و کشمیر خاص کر کشمیر میں بودھ مت کا دور دورہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ سنسکرت زبان میں اس حوالے سے کئی منظومات دستیاب ہیں لیکن میں سنسکرت زبان سے نابلد ہوں جس کے لئے معذرت خواہ ہوں کہ مثال کے طور پر کچھ سامنے نہیں رکھ سکتا اور میری ذاتی دانست کے مطابق اب تک شاید کوئی بھی فن پارہ ترجمہ کی شکل میں منتقل نہیں ہوا ہے۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

تاریخی اعتبار سے کشمیر کے لوگ جب اپنے ہمسایہ ممالک میں جاتے تھے تو وہ وہاں کے روحانی بزرگوں سے کشمیر کے سیاسی اُتھل پتھل اور پریشان شدہ حالات پر توجہ دینے کی درخواست کرتے تھے۔ چنانچہ کشمیر کے لوگوں کی دینی ودنیاوی معاملات کی رہنمائی کے لئے ترکستان کے مشہور صوفی سید اشرف الدین عبدالرحمٰن بلبل اپنے مریدوں اور عقیدت مندوں کے ساتھ ۱۳۳۶ء میں کشمیر تشریف لائے۔ ان دنوں کشمیر کے راجاوں کے آپسی جھگڑوں اور غلط کاریوں کی وجہ سے سارا نظام درہم برہم ہو چکا تھا۔ ان حالات کی وجہ سے آخر کار ہندوراجاؤں کو اقتدار سے ہاتھ دھونا پڑا تھا اور لداخ کا ایک شہزادہ جس کا نام رنچن شاہ تھا کشمیر کا حکمراں بن گیا۔ رنچن شاہ اپنی ہندو بیوی ''کوٹہ رانی'' اور وزیروں کے ساتھ بلبل شاہ کے ہاتھوں بیعت ہو کر کے مسلمان ہو گیا۔ بلبل شاہ نے اس کا نام سلطان صدرالدین رنچن شاہ رکھا۔ رنچن شاہ کا ایک وزیر جو خود بھی مسلمان ہو گیا تھا فارسی زبان سے واقف تھا وہ بلبل شاہ سے دین واسلام کی باتیں سن کر اور سیکھ کر مقامی لوگوں میں اسلام کی تبلیغ کیا کرتا تھا۔ اس طرح قرآن واحادیث اور اسلامی تعلیمات کی وجہ سے عام کشمیری لوگ فارسی اور عربی زبانوں سے واقف ہونے لگے۔ حضرت بلبل شاہ کے بعد ۱۳۷۲ء میں ایران کے مشہور صوفی بزرگ امیر کبیر حضرت میر سید علی ہمدانی متعدد عالموں، مبلغوں اور عبادت گذار مریدوں کے ہمراہ کشمیر تشریف لائے، عقیدت اور محبت کی بنا پر شاہ ہمدان کے نام سے مشہور زمانہ ہوئے۔ آپ فارسی کے کہنہ مشق شاعر تھے جن کے اشعار کو تبرک سمجھ کر پڑھا جانے لگا، فارسی زبان سے عام وخاص کو دلچسپی پیدا ہونے لگی اور بحیثیت مسلم قرآنِ پاک کے فارسی ترجمے کو سننے اور پڑھنے کے شیدائی ہونے لگے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل علم طبقہ فارسی لکھنے اور پڑھنے میں ایک اہم مقام رکھنے لگے۔ سلطان زین العابدین بڈشاہ کے عہد (۱۴۲۰ء تا ۱۴۷۰ء) میں فارسی نے علمی وادبی زبان کی حیثیت اختیار کرلی۔ بڈشاہ نے

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

سنسکرت کتابوں کے ترجمے فارسی میں کروائے، خود بھی فارسی میں شعر کہتے تھے۔ عبدالاحد آزاد فارسی کے حوالے سے یوں لکھتے ہیں:

''سلطان زین العابدین بڈشاہ کے بعد.... کشمیری زبان کے عروج کی جگہ فارسی زبان نے لے لی۔ فارسی زبان کا عام رواج ہوا تبھی باہر سے کامل الفن شعرا یہاں آئے۔ ان کے فیض واثر سے یہاں بھی (فارسی کے) بڑے بڑے فن کار پیدا ہوئے بعض فصحا نے تو اپنی قابلیت کے وہ جوہر دکھائے کہ فارسی کے اہل زبان تک انگشت بدنداں رہ گئے''۔[1]

عبدالقادر سروری نے بھی اپنی کتاب ''کشمیر میں اُردو'' میں لکھا ہے:

''چودہویں صدی میں ایران اور وسط ایشیا سے آنے والے علما کے ساتھ اسلام اور ایرانی تہذیب کشمیر پہنچی اور فارسی زبان کو فروغ ہوا۔ ایک زمانے میں کشمیر پر ایرانی تہذیب کے اثرات اتنے گہرے ہو گئے تھے اور فارسی زبان میں لکھنے والوں کی اتنی کثرت تھی کہ اہل ایران ''کشمیر'' کو ''ایران صغیر'' کہنے لگے تھے''۔[2]

فارسی زبان نے اس تیز رفتاری سے عوام الناس میں اپنی جگہ بنائی کے ''شھمیری دور حکومت'' میں سرکاری زبان کا درجہ حاصل کر لیا۔

مذکورہ سطور میں یہ ذکر کیا گیا تھا کہ سید علی ہمدانی فارسی اور عربی کے عالم تھے اور انھوں نے کشمیر میں فارسی زبان وادب کے فروغ میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ آپ نے بیس سے زائد رسالے لکھے ہیں ان میں سے چند نام درج ہیں، جواب بھی اہم مقام رکھتے ہیں۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

۱۔ رسالہ معرفت زُہد

۲۔ رسالہ اورادیہ

۳۔ رسالہ چہل حدیث

۴۔ رسالہ ذِکریہ

۵۔ رسالہ کشف الحقائق

۶۔ رسالہ مکتوبات

ان رسائل کے علاوہ ازیں ان کی مناجات اور غزلیں، مثنویاں اور دیگر شعری تخلیقات بھی شامل ہیں۔ کشمیری حکمرانوں میں سلطان زین العابدین بڈشاہ اور قطب الدین کا الاصل تو کشمیری تھا لیکن عہد دستور کے مطابق مقامی زبان کے بجائے یہ بھی فارسی میں ہی شعر موزوں کرتے تھے۔شاعری کے علاوہ دینی و تعلیمی مراکز بھی قائم کیے، اپنے درباروں اور درسگاہوں میں علما کو دعوت دی۔ مثلاً سلطان زین العابدین کے دربار میں ملا احمد کشمیری (ملک الشعرا) تھے جنھوں نے دارالترجمہ کے لیے کلہن کی ''راج ترنگنی'' کا فارسی میں ترجمہ ''بحرالاسمار'' کے نام سے کیا تھا۔آپ کے علاوہ دیگر صوفیا، اُدبا اور شعرا جن میں مرزا حیدر دوغلوت، ملا نامی، بابا طالب اصفہانی، میر علی مولانا مہدی اور مولانا احمد خاص طور پر مشہور ہیں، اپنے دینی، علمی، ادبی اور شعری افکار وخیالات کے اظہار کے لیے فارسی کو وسیلہ بنایا۔ پایے کی بات یہ ہے کہ اس عہد میں مرد ہی کیا کہ خواتین بھی فارسی اور عربی کا شوق رکھتی تھیں۔ عبدالقادر سروری نے اس سلسلے میں لکھا ہے:

> ''سلطان زین العابدین کے بعد حسن شاہ کے عہد میں.....فارسی علم و ادب کا ذوق مردوں سے گذر کر خواتین تک بھی پہنچ گیا تھا۔ چنانچہ حسن شاہ کی ملکہ شاہ بیگم کو بھی علم وادب سے لگاو تھا اور اس نے ایک

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

مدرسہ اشاعت علم کی غرض سے تعمیر کروایا تھا۔اس کی والدہ گل خاتون
کو بھی علم کی اشاعت اور ترقی کا شوق تھا۔زاہدہ خاتون ایک عارفہ
تھیں جن کی اخلاقی کہاوتیں فارسی میں ملتی ہیں''۔ [۳]

شہمیری اور چک حکمرانی کے انحطاط کے بعد جب کشمیر پر مغلوں کا تسلط ہوا تو اکبر اور جہانگیر کے عہد کے سر برآوردہ فارسی شعرا، عرفیؔ، فیضیؔ اور انشا پرداز ابوالفضل کا بھی کشمیر سے تعلق رہا۔جس عہد میں ہندوستان کے دیگر حصوں میں اردو جوبن پر آ رہی تھی اس کے پیش نظر کشمیر کی سرزمین بھی اردو کی نشو ونما کے لئے ہموار رہی، صرف فارسی ہی نہیں بلکہ عربی زبان نے بھی اردو کے پھلنے پھولنے میں کلیدی کام کیا ہے چونکہ عربی زبان راجہ ہرش کے عہد میں ہی داخل ہو چکی تھی۔ چودہویں صدی سے سولہویں صدی تک اسلام نے اہل کشمیر کو اپنے دائرے میں لے لیا تھا اور آٹھارہویں صدی میں بیرون ریاست سے لوگوں کی آمدورفت بڑھ گئی تھی۔اس صدی میں آپسی تعلقات کی بنا پر جموں و کشمیر پنجاب کے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زیر اقتدار میں آ گیا تھا۔اس دورِ حکومت میں کشمیر کے لوگوں کے حق میں مثبت نتائج ثابت نہیں ہوئے، بہت زیادتیاں ہوئیں جن کے ردعمل میں آئے دن احتجاج اور بغاوتیں ہوئیں، حالات کی تاب نہ لاکر مجبوراً ہجرتیں ہوئیں۔جن شہروں میں آنا جانا عام تھا ان میں خاص کر لاہور، جالندھر اور امرت سر ہیں۔جو اس وقت اردو کی ترویج و تالیف کے ادبی مراکز تھے۔ عام لوگوں کے تال میل کی وجہ سے اس وقت کے اردو ادبا و شعرا نے بھی کشمیر کے فطری حسن سے اپنے ادب کو حسین موضوعات دینے کے لئے رخ کیا۔عربی، فارسی اور اردو کی طرح کشمیر کی مقامی زبانیں کشمیری، گوجری، پہاڑی، گریزی اور بلتی بھی دائیں سے بائیں لکھی جاتی ہیں۔ان زبانوں کی لسانی ساخت اور اِملا ذرا سے فرق کے ساتھ اُردو کی لسانی ساخت اور املا سے مماثلت رکھتا ہے۔ بیرون جموں و کشمیر سے آنے

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

والے لوگ مقامی زبانوں سے ناواقف تھے، رابطے کی غایت دوطرفہ تھی۔ اس مقام پر سامنے اردو زبان موجود تھی اہل کشمیر والوں کو اردو زبان سے دلچسپی بھی تھی تو انھوں نے نہ صرف اردو زبان اختیار کی بلکہ اس کے پھلنے پھولنے میں اہم کردار بھی نبھایا۔ جس کی وجہ سے اتنے محیط عرصے میں ہی اردو مضبوط اور مستحکم حیثیت حاصل کرگئی۔ جموں وکشمیر کے نظم ونسق میں اُتھل پتھل اور بگاڑ کے سبب سے مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنی حکمرانی کی باگ ڈور بہادر ڈوگرہ افسر گلاب سنگھ کو سونپ دی تھی۔ گلاب سنگھ نے صرف سیاسی مصلحتوں اور کاروباری ضرورتوں کے تحت دہلی اور لاہور کی حکومتوں کے ساتھ تعلقات ہی قائم نہیں کیے بلکہ اپنے دربار میں مختلف علوم وفنون میں مہارت رکھنے والے غیر ریاستی ماہرین اور افسران کو بھی ملازم رکھا جو اُردو داں تھے۔ اس بات کی تصدیق ڈاکٹر برج پریمی کے اس اقتباس سے بھی ہوتی ہے:

> ''ڈوگرہ عہد میں کچھ عرصہ تک ''نقیبوں'' کو ہندوستان کے مختلف شہروں سے بلاکر اپنے دربار میں اس غرض کے لئے تعینات کیا گیا تھا کہ وہ ڈوگرہ دربار میں مغلئی جاہ وجلال کا سا انداز پیدا کریں۔ چنانچہ جب مہاراجہ دربار میں آتا تھا تو اس کی آمد کا اعلان مغلئی (مغل بادشاہوں کے) انداز سے کیا جاتا تھا۔ ان نقیبوں کے ساتھ ان کے پورے پورے خاندان بھی ہوتے تھے جن کی بول چال اُردو تھی۔ اس طرح سے بھی اُردو زبان کا جموں وکشمیر میں عمل دخل شروع ہوا''۔ ۶

مہاراجہ گلاب سنگھ کے سامنے مغلیہ حکومت کا نقشہ تھا جس کا اتباع کرنا راجا کے لئے باعث فخر تھا۔ فارسی کو درباری زبان کا درجہ دینا، مغلوں کے رسوم ورواج اور تہواروں کو

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

ویسے ہی منانا، دربار سجانا اس بات کی دلیل ہے۔ ان موقعوں پر بیرونِ ریاست کے فنکاروں، گانے بجانے والوں، رقاص و بازیگروں کو دعوت شرکت دیتے تھے جو اردو زبان بولتے تھے اور باہم تبادلہ خیال بھی اردو میں ہی کرتے تھے۔ گلاب سنگھ کے عہد حکمرانی میں زیادہ تر افسران اُردو سے نہ صرف آشنا تھے بلکہ دفتری کام فارسی کے ساتھ ساتھ اُردو میں بھی کرتے تھے۔ لاہور چونکہ اردو کا ایک مرکز تھا کے علاوہ ہندوستان کے دیگر حصوں سے اخبارات و رسائل جموں و کشمیر میں پہنچتے تھے۔ جموں و کشمیر کے نو آموز اُردو شعرا و ادبا کی تخلیقات کے شائع ہونے کا ذریعہ بھی یہ ہی اخبارات و رسائل بنے۔ ہندوستان کے دیگر شہروں میں تھیٹریکل کمپنیوں کا چلن عام تھا تو گلاب سنگھ نے بھی ان کمپنیوں کو جموں و کشمیر میں ڈرامے پیش کرنے کے لئے اجازت دی، کمپنیوں نے گلی گلی میں جا کر اپنے ڈرامے پیش کئے۔ لوگ نہ صرف ان کے قریب ہوئے بلکہ ڈرامے دیکھنے کا ذوق و شوق بھی رکھتے تھے۔ قوالی گانے کا رواج بھی عام ہونے لگا تو لوگ بے ساختگی میں اشعار گنگناتے تھے۔

اہم بات یہ کہ اس وقت فورٹ ولیم کالج (۱۸۰۰) اور دلی کالج (۱۸۲۷) میں بہت سارا ترجمہ شدا مواد بھی جموں و کشمیر میں پہنچا۔ جس سے تعلیم یافتہ طبقہ میرؔ و غالبؔ کی شاعری اور میرؔ امن اور رجب علی بیگ سرورؔ کی نثر سے بھی واقف ہوئے۔ بالآخر ۱۶ مارچ ۱۸۴۶ء میں برطانوی حکومت کے زیر اثر آ کر گلاب سنگھ نے جموں و کشمیر کو ۷۵ لاکھ کے عوض فروخت کر دیا تھا۔ جس کا اظہار علامہ اقبال نے اپنی شاعری میں یوں کیا ہے:

اے باد صبا گر بہ جینوا گذر کنی
حرفے زما بہ مجلس اقوام باز گوئے
دہقاں و کشت وجوئے و خیاباں فروختند
قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

علامہ اقبالؔ کا تو تعلق ہی اسی سرزمین سے تھا تو اس سودے سے فطری متاثر ہونا ان کے لئے بجا بھی تھا لیکن اردو ادب کے دیگر شعرا بھی متاثر نظر آتے ہیں۔ حفیظ جالندھری اس طرح اظہار کرتے ہیں:

لوٹ لی انسان کی قسمت پچھتر لاکھ میں
بک گئی کشمیر کی جنت پچھتر لاکھ میں
مرد کا سرمایہ محنت پچھتر لاکھ میں
عورتوں کا جوہر عصمت پچھتر لاکھ میں ۵

گلاب سنگھ نے حکومت سے دست برداری کے بعد ۱۸۵۶ء میں مہاراجہ رنبیر سنگھ کو حکومت سونپ دی۔ رنبیر سنگھ (۱۸۵۷ء تا ۱۸۸۵ء) کے دور میں گرچہ سرکاری زبان فارسی ہی رہی لیکن اس دور میں اُردو زبان نے اپنے قدم مظبوط کئے۔ آپ ایک علم دوست حکمران تھے، اپنے عہد حکمرانی میں انتظامی معلومات کے لئے شیر سنگھ مہتہ سے اردو زبان میں رپورٹیں تیار کروائیں، اس کے علاوہ جب شیر سنگھ مہتہ نے بلخ کا سفر کیا تو واپس آکر اپنا سفرنامہ اردو میں ہی لکھا بقول برج پریمی:

''چودھری مہتہ شیر سنگھ نے ۱۸۶۴ء تا ۱۸۶۶ء کے دوران بخارا کا سفر کیا۔ واپسی پر اس نے اُردو میں اپنا سفرنامہ قلم بند کیا۔ یہ ریاست میں سرکاری طور پر پہلی اُردو تحریر تسلیم کی گئی ہے۔ صفحات پر مشتمل یہ سفرنامہ بڑا دلچسپ ہے''۔ ۷

لیکن شیر سنگھ مہتہ نے سفرنامہ کے علاوہ بھی اور کئی کتابیں اُردو میں لکھیں جو اس طرح ہیں۔

۱ احوال ملک لداخ: یہ کتاب ۱۸۶۹ء میں مکمل ہوئی جس میں لداخ کے لوگوں کے سماجی و تہذیبی حالات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

۲ ترجمہ بھگوت گیتا

۳ ترجمہ۔تاریخ انگلستان

رنبیر سنگھ کے زمانے میں اُردو عوامی رابطے کی زبان Lingua Franca بن چکی تھی لہٰذا اُردو کی علمی ادبی اور انتظامی افادیت کے پیشِ نظر ریاست میں اُردو کو ذریعہ تعلیم بنادیا گیا تھا۔ کشمیر کے ایک مشہور شاعر قیصر قلندر نے ''کشمیر میں اُردو'' کے عنوان سے اپنے مضمون (مطبوعہ شاعر بمبئی ۱۹۶۱ء) میں اس بات کی تصدیق کی ہے کہ۔

''مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد حکومت سے آج تک اُردو زبان اسکولوں میں ذریعہ تعلیم رہی ہے''۔۸

مہاراجہ رنبیر سنگھ نے سنسکرت کالج، ایک لائبریری (رنبیر لائبریری) اور دارالترجمہ قائم کیا۔ ان میں ''دارالترجمہ'' نے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ عبدالقادر سروری کے بقول:

''اس دارالترجمہ کے ناظم پنڈت گنیش کول مقرر ہوئے تھے۔ دارالترجمہ کے انتظام کے بارے میں اب تک کوئی تفصیلات دستیاب نہیں ہوئیں۔ اتفاق سے حکومت کی نظم ونسق کی ایک رپورٹ میں، جو ۱۸۸۳ء اور ۱۸۸۲ء کی میں لکھی گئی ہے ایک اندراج ملتا ہے جس سے اس کے ایک سال کے اخراجات سے ترجمہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ ۴۵۰۲ روپیہ اجرت ترجمہ پر اس سال صرف ہوا اور سال حال میں کوئی کتاب جو انگریزی سے شاستر اور شاستری سے بھاشا اور عربی سے اُردو میں ترجمہ ہوئی ہیں ختم نہیں ہوئی ہیں لہٰذا اُن کی تفصیلی رپورٹ سال آئندہ میں درج ہوگی''۔۹

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

جب یہ ادارہ بند ہو گیا تو سارہ ادبی سرمایہ ریسرچ لائبریری سرینگر میں شفٹ کیا گیا۔ انتظامیہ کی عدم دلچسپی سے متعدد مخطوطے اِدھر اُدھر ہو گئے ہیں، جو موجود ہیں انھیں اب اقبال لائبریری (کشمیر یونیورسٹی) میں منتقل کیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ رنبیر سنگھ نے ''بدیا بلاس پریس'' کے نام سے ایک چھاپہ خانہ بھی قائم کیا، جس سے دارلترجمہ میں ترجمہ شدہ کئی کتابیں شائع کی گئیں۔ ان کتابوں کے تراجم اور مسودوں کی تیاری میں غلام غوث خان، پنڈت بخشی رام، مولوی فضل الدین، لالہ بسنت رائے وغیرہ اسمائے گرامی اہم ہیں۔ ۱۸۸۵ء میں جب مہاراجہ رنبیر سنگھ فوت ہو گئے تو مہاراجہ پرتاب سنگھ ان کے جائے نشیں ہوئے۔ ان کے عہد تک فارسی ہی سرکاری زبان تھی لیکن مہاراجہ پرتاب سنگھ نے اپنے دور حکومت میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا جس کے صحیح سال تاریخ کا اختلاف ہے۔ محمد یوسف ٹینگ (۱۸۸۵ء)، برج پریمی (۱۸۸۹ء)، بلدیو پرشاد اپنے ایک مضمون (مطبوعہ شیرازہ (۱۹۸۸ء) میں ۱۸۸۶ لکھتے ہیں۔

پرتاب سنگھ نے عیسائت تبلیغ کے ردعمل میں ''سناتن دھرم سبھا'' قائم کی تو سالک رام سالگ نے کئی کتابچے لکھے جو حسب ذیل ہیں۔

۱ مورتی منڈن

۲ دھرم اُپدیش

۳ ارتھ شاشتر

۴ لغت اُردو

۵ محاورات اُردو

۶ داستان جگت روپ وغیرہ۔

سالک رام سالک کے بڑے بھائی پنڈت ہرگوپال خستہ جو ہجرت کر کے لاہور

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

چلے گئے تھے اور کتاب "گلدستہ کشمیر" لکھی جس کو پروفیسر قدوس جاوید نے اپنے ایک مضمون (مطبوعہ اردو دنیا، دہلی ۲۰۱۲ء) میں جموں وکشمیر کی پہلی نثری تصنیف قرار دیا۔ اس کے علاوہ ہرگوپال کول خستہ نے ڈپٹی نذیر احمد کے ناول "مراۃ العروس" کے تتبع میں ایک قصہ "گلزار فواعد بھی لکھا۔

اس دور حکومت (ڈوگرہ حکومت) میں پریس قائم کرنے اور اخبار و رسائل جاری کرنے کی پابندی تھی۔ تو اہل کشمیر بیرونِ کشمیر کے دوسرے شہروں سے اخبارات و رسائل جاری کرتے تھے۔ جن میں "اخبار عام"، "خیر خواہ کشمیر"، "ہمدرد ہند"، "کشمیری گزٹ"، "کشمیری میگزین"، "کشمیری مخزن"، "صبح کشمیر"، "بہار کشمیر" اور "پنجہ فولاد" وغیرہ اہم ہیں۔ لیکن بیسویں صدی میں جموں وکشمیر سے ڈوگرہ حکومت کی اجازت کے مطابق پہلا اخبار "رنبیر" ۱۹۲۴ء میں جاری ہوا جس کے اڈیٹر ملک راج صراف تھے۔ اس کے بعد کشمیر سے "وِتستا"، "ہمدرد"، "صداقت"، "مارتنڈ"، "وکیل"، "حقیقت"، "خالد" اور "خدمت" وغیرہ اخبارات شائع ہوتے رہے۔ مجموعی طور پر یہ کہ اُنیسویں صدی کے آخر تک اردو زبان جموں وکشمیر کے لوگوں کے رابطے کی زبان، تعلیم کی زبان اور تصنیف و تالیف کی زبان بن چکی تھی۔ بلفظ دیگر یوں کہا جائے کہ اردو زبان کو اتنی ہی ترقی ہوئی تھی جتنی ہندو پاک کے دوسرے مراکز میں ہوئی۔ لہٰذا میرے مضمون کا موضوع "جموں وکشمیر میں اردو زبان کے ابتدائی نقوش" ہے جس کی بندش کو ملحوظِ نظر رکھتے ہوئے جموں وکشمیر میں اردو ادب کی تار کو نہیں چھیڑا گیا، اس موضوع پر کسی دوسرے مضمون میں بات ہوگی۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

حواشی

1۔ عبدالاحد آزاد: کشمیری زبان اور شاعری حصہ اول۔ص ۴۰۔ناشر۔جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز۔۱۹۸۲ء

2۔ عبدالقادر سروری: کشمیر میں اُردو، ص ۱۹۔ناشر جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز نیا اڈیشن، ۱۹۹۳ء

3۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص ۱۳۸

4۔ حفیظ جالندھری: بحوالہ،،رص ۲۶۵، // // //

5۔ ڈاکٹر برج پریمی: جموں و کشمیر میں اُردو ادب کی نشوونما، ص ۱۸۔ناشر رچنا پبلیکیشنز، نعیب نگر، پیوش کالونی جانی پورہ جموں، ۱۹۹۲ء

6۔ ڈاکٹر برج پریمی: جموں و کشمیر میں اُردو ادب کی نشوونما، ص ۲۰۔ناشر۔رچنا پبلی کیشنز جموں ۲۰۰۴ء (تیسرا ایڈیشن)

7۔ عبدالقادر سروری: مضمون ''مہاراجہ رنبیر سنگھ اور ان کا دارالترجمہ'' مشمولہ ''ترجمہ کا فن اور روایت''۔از۔ داکٹر قمر رئیس، ص ۲۹۴۔ناشر۔ایجوکیشنل بک ہاوس علی گڑھ ۲۰۱۱ء (دوسرا ایڈیشن)

8۔ اختر الدولہ اختر شہنشاہی: مطبوعہ، اختر پریس لکھنؤ، ۱۸۸۸ء بحوالہ کشمیری پر اُردو کے اثرات از، ڈاکٹر نذیر آزاد۔ناشر۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی، ۲۰۱۲ء۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

جموں و کشمیر میں اردو افسانوں کے تخلیقی رویئے

اس بات سے کوئی دورائے نہیں ہوسکتی کہ ادب اپنے زمانے کا عکاس اور عصری حالات کا آئینہ ہوتا ہے۔ادب ایک ایسا آلہ ہے جس میں جغرافیائی ،سیاسی ،سماجی ،تہذیبی ، تمدنی ،لسانی اور رواحانی مسائل وعوامل کا رنگ مختلف جہتوں میں دکھائی دیتا ہے۔ دنیا بھر میں ادب کے دورخ یعنی نثر اور نظم موجود ہیں ۔یوں تو تخلیقی اعتبار سے نظم پہلے اور نثر بعد میں ظہور پذیر ہوئی لیکن میلان ،رویے ،رجحان اور تحریک کی صورت میں ایک مسلسل ارتقا دونوں میں کارفرما رہتا ہے۔آج جموں وکشمیر میں اردو نثر میں ہیت ،فن اور اسلوب کی سطح پر جو مہتم بالشان سرمایہ میسر ہے اس کے پیچھے ایک پوری روایت موجود ہے جو تغیر وتبدل سے ہمکنار ہوتی ہوئی مختلف صورتوں میں ہم تک پہنچتی ہے۔ تخلیق کی اس روایت کو عبدالقادر سروری ،نورشاہ ، برج پریمی ، حامدی کاشمیری ، جان محمد آزاد ، پروفیسر جاوید قدوس کے علاوہ سلیم سالک وغیرہ نے دریافت کرنے کی کامیاب کوشش کر چکے ہیں۔ لیکن معاصر لکھنے والوں سے متعلق ایسی کوئی کاوش یا جستجو سامنے نہیں آئی جس کو احاطہ تحریر میں لانے کی ضرورت ہے۔

اردو ادب کے افسانوی ادب کی تاریخ وارتقاء یا تعریف کے تار کو نہ چھیڑتے

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

ہوئے یہاں پروفیسر قدوس جاوید کے مضمون میں سے ایک اقتباس پیش کر دیتا ہوں جو افسانے کی پہچان کروانے میں کافی مدد کرتا ہے:

''اپنی ذات اور آس پاس کی زندگی اور زمانہ کے خارجی اور باطنی تفاوت اور تضادات کا کوئی پہلو جب قلم کار کی تخلیقیت کا حصہ بنتا ہے اور وہ قلم کا نثری بیانیہ (Narrative) کے مخصوص صنفی تقاضوں اور فنی و جمالیاتی دروبست کے ساتھ ضبطِ تحریر میں لاتا ہے تو اس کو افسانہ کہتے ہیں۔''[1]

ایک تخلیق کار اپنی تخلیقیت کے لئے اپنی ذات سے لیکر پوری کائنات کے مسائل و واقعات سے متاثر ہوتا ہے۔ جس دور یا ماحول میں وہ اپنی زندگی جیتا ہے اس ماحول کی بازگشت اس کی تخلیق میں سنائی دیتی ہے۔ جموں و کشمیر کے معاصر اردو افسانہ نگاروں کی تخیلقات کا مطالعہ کریں تو ان افسانوں کے موضوعات اور اسلوب سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ ایک خوف کی فضا چھائی ہوئی ہے اور خوف ان افسانہ نگاورں کے لئے ایک استعارہ بن چکا ہے۔ عصری دور کے لکھنے والوں نے نئی تلاش اور نئی بصیرت کا منظر نامہ سامنے لایا ہے جس کا موعاتی دائرہ کار کافی وسیع ہے۔ ان افسانہ نگاروں نے جس کامیابی سے اپنے خارجی تجربات و مشاہدات اور اپنے داخلی جذبات و احساسات کے اظہار و بیان کے لئے فنی شرائط کا استعمال کیا ہے اس سے ایک مخصوص عہد کا معیار اور مزاج متشکل ہوتا ہے۔ نور شاہ، ترنم ریاض، حامدی کاشمیری، آنند لہر، خالد حسین، آمین بنجارہ، وید راہی، مشتاق احمد وانی، ولی محمد، حسن ساہو، ڈاکٹر ظہور الدین، وریندر پٹواری، جان محمد آزاد، غلام نبی شاہد، دیپک بدکی، ذنفر کھوکھر، منصور احمد منصور، پرویز مانوس، شیخ خالد کرار، ریاض توحیدی اور غنی غیور وغیرہ کے علاوہ بھی کئی کامیاب افسانہ نگار اس روایت کو خونِ جگر سے سینچ رہے

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

ہیں۔ اس کہکشاں کے تخلیقی سرمائے کا اگر مطالعہ کریں تو عصری حالات و واقعات کی ایک مکمل تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ریاست میں اردو افسانے کے ابتدائی نقوش پریم ناتھ پردیسی اور محمد دین فوق ہیں۔ لیکن افسانے کے اس پودے کی آبیاری کرنے والوں میں نورشاہ کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ انہوں نے کشمیر کے حسن کے ساتھ ہی ساتھ عصری حالات اور کرداروں کے انتخابات سے اپنے افسانوں کو مختلف رنگ میں رنگا ہے۔ انہوں نے اپنے بیشتر افسانوں میں جنسی کج روی کو موضوع بنایا ہے۔ جس سے لگتا ہے کہ وہ سعادت حسن منٹو اور فرائڈ کے جنسی نظریات سے کافی متاثر ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اُن کے افسانوں میں رومانیت اور حقیقت نگاری کا حسین امتزاج بھی ملتا ہے جو دوسرے تخلیق کاروں سے انھیں الگ رکھتا ہے۔ ان کے اب تک تقریباً سات افسانوی مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں جن میں ''بے گھاٹ کی ناؤ''، ''ویرانے کے پھول''، ''گیلے پتھروں کی مہک''، ''من کا آنگن''، ''بے ثمر کا سچ''، ''آسمان لہو اور پھول'' ہیں۔

> ''نورشاہ کے افسانوں میں شاعرانہ تخیل طرازیاں سب سے زیادہ ہیں۔ ان کے ابتدائی افسانے سے لے کر اس وقت کے سبھی افسانوں میں یکساں اور ہموار فضا ملتی ہے۔ جس نے ان کے افسانوں کو ایک محدود، دائرے میں مقید کر دیا ہے۔ مگر اس کے باوجود ان کے افسانوں میں ''زخم خوردہ دلوں'' کی دھڑکنیں ملتی ہیں۔''[۲]

نورشاہ نے جہاں شعری انداز میں پیکر راشے ہیں وہاں مشاہدے کی باریکی اور غور و فکر کی گہرائی کے ساتھ زندگی کے انفرادی اور خارجی پہلوؤں کو اجاگر کر کے تلخ اور حسین

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

لمحات کو ایک ہی لڑی میں پرو دیا ہے۔ ان کے افسانوں میں جموں و کشمیر کے عوام کے دکھ درد، رہن سہن اور تہذیب و ثقافت کی منظر کشی نمایاں طور پر جھلکتی ہے۔ مثال کے طور پر ان کے افسانوں سے چند اقتباس پیش ہیں:

''لیکن وقت نے اچانک کروٹ بدلی، کشمیر جو کبھی اپنی سندرتا، خوب صورتی اور حسن کے ساتھ ساتھ پیار و محبت اور آپسی بھائی چارے کے لئے برصغیر کی تاریخ میں ایک بڑی اہمیت اور منفرد مقام کا حامل تھا، نہ جانے کیوں اور کیسے بدصورتی کے ایک ایسے دلدل میں پھنس گیا کہ یہاں کی زندگی مفلوج ہو کر رہ گئی، سڑکیں خون آلودہ ہونے لگیں، معصوم سینے چھلنی ہونے لگے۔''[۳]

''اس کے بعد ہم باتیں کرتے رہے۔ کشمیر کی باتیں، کشمیر کے ملکوتی حُسن کی باتیں، حسین مرغزاروں کی باتیں، کشمیر کے ملکوتی پہاڑوں کی باتیں، زعفران زاروں کی باتیں، ہم نے باتیں کیں اُن لوگوں کی جو کشمیر کے کھیتوں میں بسیرا کرتے ہیں۔ ڈھلانوں پر سیاح لوگوں کے گھوڑوں کے آگے پیچھے ننگے پاؤں دوڑتے ہیں۔ اُکھڑی ہوئی سانسوں کے ساتھ ہانپتے اور کانپتے ہوئے پہلگام کے حسین مرغزاروں میں گورے اور کالے لوگوں کے درمیان گھرے ہوئے، اپنے چاک پیرہن رفو کرنے والوں کی۔ ان لوگوں کی جو دوسروں کے لئے پھول چنتے ہیں اور اپنے دلوں کے مرجھائے اور پژمردہ گلوں کا ہار پروتے ہیں۔ کشمیر کے اُن لوگوں کی باتیں جو جھیل وُلر کی وسیع گہرائیوں میں خاردوار سنگھاڑوں کے لئے غوطے لگاتے ہیں۔''[۴]

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

اصل نام عبدالمجید قلمی نام عمر مجید ایک اُستاد ہونے کے ساتھ ساتھ صحافت (روزنامہ آفتاب) سے بھی منسلک رہے۔ ان کا ایک افسانوی مجموعہ ''اجالوں کے گھاؤ'' شائع ہوا ہے۔ اس کے علاوہ سلیم سالک نے ان کے افسانوں کو منتخب کر کے کتابی شکل دی ہے۔ ان کے افسانوں کے مطالعہ سے لگتا ہے کہ انہوں نے غربت جیسے موضوعات پر قلم اُٹھایا ہے اور فنی وتکنیکی شرائط کو کامیابی سے برتا ہے۔ ان کے افسانوں کی اہم خاصیت ان کے اسلوب کا ستھرا پن ہے۔ انہوں نے اپنے ایک افسانے ''مردہ چنار'' میں موسم سرما کی منظر کشی کی گئی ہے۔ کس طرح پہاڑ پر برف گرتے ہی وادی میں چناروں کے پتے کمزور ہو کر گرنے لگتے ہیں اور ایک غریب طبقہ ان پتوں کو کس سلیقے اور اہتمام کے ساتھ جمع کرتا ہے۔ افسانہ مردہ چنار سے ایک اقتباس پیش ہے:

> ''پھر جب شام کی ہوائیں زیادہ خنک ہونے لگیں اور دور مغربی پہاڑوں پر سال میں پہلی برف گری تو چنار کے سارے پتے سرخ ہو کر زمین پر گر گئے۔ پھر ایک چمکیلی صبح کو رحمان اس کی بیوی اور اس کے سب بچے پتوں کو ڈھیروں میں جمع کرنے لگے۔ رحمان کی بیوی ہلکی لے میں گانے لگی جیسے برف گر رہی ہے۔''[۵]

ایسے ہی موضوع پر ان کا ایک اور افسانہ ہے ''محمد شمیم کو کشمیر جانا ہے'' اس میں بھی کانگڑی کا استعمال کتنا ضروری ہوتا ہے کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کے افسانوں میں عصری حالات کی خوف ناک صورت حال کی منظر کشی کو کن کن علامتوں اور استعاروں میں پیش کیا گیا ہے اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے:

> ''یہ کونسی جگہ ہے۔ یہ کیسی خاموشی ہے۔ یہ ویرانی کا عالم، یہ ڈرا دینے والی خاموشی، یہ مکان، یہ دکانیں، یہ سڑکیں خالی کیوں ہیں؟ اس شہر

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

میں رہنے والے لوگ کہاں چلے گئے ہیں۔۔۔ شاید سب لوگ
غائب ہوگئے ہیں۔''[6]

پروفیسر ظہورالدین جتنے بڑے نقاد، محقق اور شاعر ہیں اتنے ہی ایک کامیاب افسانہ نگار بھی ہیں۔ ان کی عظمت ترقی پسند اور جدیدیت کا امتزاج ہے۔ ان کے دو افسانوی مجموعے ''تلافی'' اور ''کینی بلز'' منظر عام پر آچکے ہیں جن میں علامتی افسانے زیادہ ہیں۔ فرد کی تنہائی، سسکتی زندگی، سماج کے سلگتے ہوئے مسائل کو انھوں نے اپنی کہانیوں کی زینت بنایا۔

اصلی نام شیام سندر آنند اور دنیا میں مشہور آنند لہر کے نام سے ہوئے۔ ان کا تعلق ایسے خطے سے ہے جس سے کرشن چندر، چراغ حسن حسرت، ٹھاکر پونچھی اور بلراج بخشی تھا۔ پیشے سے وکیل ہیں لیکن اردو زبان سے جس قدر دلچسپی ہے اس کا ثبوت ان کے ناول، افسانے، ڈرامے اور ان کی شاعری ہے۔

اگر کہا جائے کہ جموں وکشمیر میں تجریدی افسانے کی بنیاد آنند لہر نے ہی ڈالی تو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ انہوں نے علامتی افسانے بھی لکھے ہیں مگر علامتی افسانے ان سے پہلے بھی ریاست میں لکھے جا چکے ہیں۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''سرحد کے اس پار'' ہے۔ جس میں بڑے فنکارانہ طریقے سے تقسیم کے المیے کی عکاسی کی ہے۔ ایک طرف افسانہ نگار نے بلند پایہ نثری تحریر کا ثبوت دیا تو دوسری طرف روایت سے ہٹ کر ہر افسانے میں مجموعی طور پر انسانی قدروں کی بازیابی، ہندو مسلم اتحاد، قومی یکجہتی، انسانی قدروں کے لئے جدوجہد، سماجی خلیجوں کو استوار کرنے کے جتن، زندگی کو سدھارنے کی کاوش، سیاسی جادوگری اور جنسی موضوعات کے کاموش تاروں پہ مضراب پھیرنے کی صحت مند کوشش کی ہے۔ ان کے افسانوں کے چند اقتباس پیش ہیں:

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

''ایک دن دونوں ملے تو گوپی نے روشن سے پوچھا۔ کس کس سرحد کو

ئی فرقوں کی سرحد، مذہبوں کی سرحد، قوموں کی سرحد، لوگ ان

سرحدوں کو مٹا کیوں نہیں دیتے؟ گوپی بولی۔ یہی بدقسمتی ہے، لوگ

سرحدوں کو بدلتے ہیں، انھیں ختم نہیں کرتے، وہ جنگ لڑتے ہیں،

خون بہاتے ہیں مگر پھر ایک نئی سرحد قائم کر لیتے ہیں۔'' ۷

''جب دونوں ملکوں کے لیڈر ملتے ہیں، فوجی ملتے ہیں، چور ملتے ہیں،

اسمگلر ملتے ہیں، جج ملتے ہیں، کھلاڑی ملتے ہیں تو عام لوگ کیوں نہیں

مل سکتے۔'' ۸

''محبت کے ایک لفظ کے آگے مذہبی کتابوں کے فلسفے چھوٹے نظر

آتے ہیں۔'' ۹

اس افسانوی مجموعے کے افسانوں میں اختصار، مقصدیت، معنویت، مشاہدے کی غیر معمولی گہرائی اور وسعت کا خصوصی طور پر ذکر ملتا ہے۔ ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''انحراف'' ہے جس میں زیادہ تر تجریدی افسانے ہیں۔ اشاروں کنایوں میں بڑی بڑی باتیں بیان کرتے ہیں اور فقرے معنویت سے بھرپور ہوتے ہیں:

''کوئی بھی لڑنا نہیں چاہتا مگر جنگ پھر بھی جاری ہے'' ۱۰

''چاند کے سینے میں داغ ہے پر چاندنی تو بے داغ ہے۔'' ۱۱

''تمام ناموں، رشتوں اور ناطوں کا حاصل صرف تین لفظ ہیں، میں،

تم اور وہ۔'' ۱۲

''تمہاری اس انگلی کا کیا ہوا جو تم نے آسمان کو چھونے کے لئے اپنے

ہاتھ سے الگ رکھی تھی۔'' ۱۳

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

پنجابی میں چار افسانوی مجموعوں اور اردو میں تین افسانوی مجموعوں کے مالک خالد حسین کافی شہرت یافتہ ہیں۔ ان کا افسانوی مجموعہ ''ٹھنڈی کانگڑی کا دھواں''، جس میں کل 33 کہانیاں شامل ہیں اور اس مجموعے میں وہ کہانی بھی موجود ہے جس کی وجہ سے انھیں معطل کیا گیا تھا۔ کھوکھلا سورج، گھاس پر چلنا منع ہے، گوری فصل کے سوداگر، شمع ہر رنگ میں جلتی ہے، کافی بہتریں کہانیاں ہیں۔ ان کا دوسرا مجموعہ ''اشتہاروں والی حویلی'' ہے جس میں کھوکھلا سورج، پانی کی لکیریں، ابابیل کا خواب، اندھیری نگری، پتھریلے پانی میں بہتی ناو، آوارہ سانپ کا ڈنگ، شامل ہیں۔ ''ستی سر کا سورج'' کشمیری تاریخ و تہذیب پر لکھا گیا ایک اہم ناول ہے۔ اس افسانے میں خالد حسین قاری کو اپنے ماضی میں لے جاتے ہیں اور اپنی تہذیب وثقافت کی حفاظت کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ خالد حسین نے تقسیم ہند سے متاثر ہو کر کئی افسانے لکھے ہیں جس میں کشمیر بھی تقسیم ہوا تھا۔ کئی خاندان ایک دوسرے سے جدا ہو گئے تھے۔ افسانہ ''لکیر'' اور ''ایک مرے آدمی کی کہانی'' میں اس سانحہ کی کامیاب عکاسی کی ہے۔ خالد حسین نے اپنی تحریروں میں وہ باتیں بھی کہہ دی ہیں جو عام ادیب نہیں کہہ سکتا مثلاً ''میں اور میری تخلیق'' میں اپنی بیوی سے متعلق یوں لکھتے ہیں:

''میری بیوی صورت کی اچھی ہے، سیرت کی خوب ہے لیکن ایک ادیب کے ناطے میں اس کے دماغ کی خوبصورتی کی تعریف نہیں کر سکتا اگر چہ جملہ اُسے ناگوار گزرے تو وہ مجھے معاف کر دے۔''[۱۴]

ڈاکٹر اسداللہ وانی ان کے افسانوی مجموعہ ''اشتہاروں والی حویلی'' کے پیش لفظ میں یوں لکھتے ہیں:

''خالد حسین کے افسانوں میں نہ صرف حسن و جمال اور حقیقت و رومان کا امتزاج پایا جاتا ہے یا سماج میں پنپتے ناسوروں کی عکاسی کی

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

ہے بلکہ کئی دوسرے مسائل کی نفسیاتی موشگافی، حق گوئی اور بے باکی
سے بات کہنے کی جرائت مصلحانہ طنز، شگفتہ فقرہ بازی، محاوروں کا
برمحل استعمال اور کہیں کہیں ابہام بھی پایا جاتا ہے اور علامتی و
استعاراتی انداز بھی۔" ۱۵

اگر ریاست میں خواتین افسانہ نگاروں کی بات کی جائے تو عالمی شہرت یافتہ افسانہ نگار، شاعر، مترجم اور ناول نگار ترنم ریاض اپنی محنتی کاوشوں اور دلجوئی سے ایک اہم مقام رکھتی ہیں۔ ان کے اب تک چار افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ "یہ تنگ زمین"، " ابابیلیں لوٹ آئیں گی"، "یمبر زل"، "مرارخت سفر شامل ہیں۔ان کے افسانوں کے کردار معاشرے وہ افراد ہیں جو ظلم و زیادتی اور ناانصافیوں کا شکار بنے اور غریب سے غریب تر ہوتے گئے ان کی آہ وفریاد کسی نے نہ سُنی۔ انہوں نے زیادہ تر افسانے عورتوں کے مسائل پر لکھے ہیں کہ کس طرح عورت کے ساتھ ظلم وزیادتیاں ہوتی رہی ہیں ساتھ ہی ان کی تحریروں میں گھریلو ماحول اور معاشرے کا عکس دیکھتے کو ملتا ہے۔ افسانہ "یہ تنگ زمین" میں افسانہ نگار نے اپنی ماں کے تئیں بچوں سے محبت کو موضوع بنایا ہے۔ اس افسانے میں یہ بتایا گیا ہے کہ ایک ماں اتنا ہی پیار دوسرے بچوں کو دیتی ہے جتنا کہ اپنے بچوں کو کرتی ہے۔ "پورٹریٹ" ترنم ریاض کا ایک اور مشہور افسانہ ہے۔ جس میں ساس اور بہو کے بیچ اختلافات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ انہوں نے عصری زندگی کی عکاسی، جدید تہذیب سے پیدا شدہ حالات اور مسائل کی نقاب کشائی خوب کی ہے۔ مختلف واقعات کو اپنا موضوع بنا کر قاری کو تحیر، تجسس، تازگی اور لطف ولذت عطا کرتی ہیں۔ افسانہ "کشتی" میں کشمیر کے خراب حالات اور گولی بارود سے لوگ کس طرح الجھتے ہیں اور مشکلات کا سامنا کرتے ہیں اس کی عکاسی کے ساتھ ساتھ کشمیری لباس کی پہچان

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

نہایت خوبصورتی سے کرواتی ہیں:

''اس نے گھٹنوں سے ذرا اُوپر تک کی لمبائی کا ہلکے رنگوں کی چھینٹ والے کسی موٹے کپڑے کا پھرن پہن رکھا تھا۔ کُرتے کی کاٹ کا نسبتاً چوڑا، چغہ نما پیرہن، اتنا کھلا کہ اگر ہاتھ آستینوں کے اندر سے کھینچ کر جسم سے لگالئے جائیں، یا سوکھی جھاڑیوں کی آگ سے بھرے مٹی کے پیالے کے گرد بید کی نرم ہری ٹہنیوں سے بنی گئی کانگڑی اس کے اندر رکھ لی جائے، جب بھی اس پیرہن کی تنگی کا احساس نہ ہو۔ پھرن کے ساتھ اس نے نیم تنگ پائینچوں والی اسی چھینٹ کی شلوار پہن رکھی تھی۔'' ۱۶

اصل نام نصیر احمد قریشی المعروف امین بنجارہ ایک صحافی، افسانہ نگار اور تنقید نگار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ علمی وادبی اور سماجی خدمات کے اعتراف میں اُنھیں کئی انعامات و اعزازات سے بھی نوازا گیا ہے۔ ان کا اب تک ایک افسانوی مجموعہ ''الاؤ'' منظر عام پر آیا ہے۔ جس کی رسم اجراڈاکٹر فاروق عبداللہ نے کی تھی۔ یہ افسانوی مجموعہ ہمارے سماج میں پھیلی ہوئی بدعنوانیوں، دھاندلیوں، فرقہ وارانہ فسادات اور انسانی زندگی کے عدم تحفظ کی نشاندہی کرتا ہے۔ ان کے افسانوں میں ترقی پسند نظریے کی چھاپ بھی نظر آتی ہے۔

مشتاق احمد وانی موجودہ دور کے لکھنے والوں میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ اب تک ان کے دو افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''ہزاروں غم'' جس میں سولہ کہانیاں شامل ہیں۔ دوسرا افسانوی مجموعہ ''میٹھا زہر'' ہے۔ ان کے افسانوں کا مطالعہ کرتے وقت اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے گھسے پٹے موضوعات کو اپنے افسانوں کا موضوع نہیں بنایا بلکہ نئے موضوعات کو

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

اپنانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے کامیاب افسانہ نگار ہونے کا اعتراف معروف نقاد پروفیسر گوپی چند نارنگ نے بھی کیا ہے:

''ڈاکٹر مشتاق احمد وانی ایک مدت سے کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ وقتاً فوقتاً ان کی کہانیاں میری نگاہ سے گذرتی رہتی ہیں۔ وہ ایک دردمند اور احساس طبعیت رکھتے ہیں۔ وہ کشمیری اہل زبان ہیں لیکن اردو میں بھی ان کی پیٹھ مادری زبان سے کم نہیں۔ ان کی انگلیاں معاشرے کی نبض پر ہیں اور ان کی کہانیاں آج کے مسائل کے گرد گھومتی ہیں۔ وہ افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک تنقید نگار اور محقق بھی ہیں ان کی ان تصانیف میں ''تقسیم کے بعد ناول میں تہذیبی بحران'' جو 2002ء میں منظر عام پر آئی اور دوسری ''آئینہ آئینہ'' 2004ء میں شائع ہوئی۔ ان کی دوسری تصانیف میں اعتبار و معیار، شعور بصیرت اور اردو ادب میں تانیثیت منظر عام پر آکر یہ ثابت کرتی ہیں کہ وہ تحقیق اور تنقید کا بھی شعور رکھتے ہیں۔ اب تک مشتاق احمد وانی کی ان کوششوں سے اردو ادب میں گراں قدر اضافہ ہوا ہے۔'' [17]

ان افسانہ نگاروں کے علاوہ ذنفر کھوکھر بھی اہمیت کی حامل ہیں ان کے افسانوی مجموعے ''کانچ کی سلاخ'' اور دوسرا ''خوابوں کے اُس پار'' سنجیدہ افسانوی فہرست میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ جدید ترین لکھنے والوں میں سے ہیں تو اس لئے ان کی فکر بھی ایک نئی سوچ کی ترجمانی کرتی ہے۔ معاشرے میں سماجی، معاشرتی اور انسانی زندگی کے مختلف رشتوں کی عکاسی کرتی ہیں۔ دراصل پندرہ سال کے اس عبوری دور

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

کی پہنائیوں میں جو واقعات وحوادث پنہاں ہیں انھیں حقیقت کا پیکر عطا کرنے کیلئے فنی مہارت کے ساتھ ساتھ زبان وبیان کی باریکیوں پر بھی مکمل دسترس کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ فنی مہارت ذنفر کھوکھر کو حاصل ہے۔

بلراج بخشی نے جنسی مسائل کے علاوہ طنزیہ لہجے میں دیگر عناصر وعوامل کی بھی نشاندہی کی ہے جو ہمارے ملک وقوم کی سالمیت اور ترقی کے لئے خطرہ بنے ہوئے ہیں۔ ان کا افسانوی مجموعہ ''ایک بوند زندگی'' منظر عام پر آکر داد وتحسین حاصل کر چکا ہے۔ پرویز مانوس نے شاعری کے علاوہ افسانے کو اپنا ادبی مشغلہ بنایا۔ ان کے دو افسانوی مجموعے ''شکارے کی موت'' اور ''مٹھی بھر چھاؤں'' چھپ چکے ہیں۔ پرویز مانوس اپنے افسانوں میں طبقاتی کشمکش اور ان سے پیدا ہونے والے مسائل کی عکاسی اپنے انداز سے کرتے ہیں۔ ورییندر پٹواری بھی ایک اہم نام ہے جن کے اب تک تقریباً نو افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان میں ''فرشتے خاموش ہیں''، ''دوسری کرن''، ''ادھوری کہانی''، ''افق''، ''دائرے''، ''آفتوں کے دور میں''، اور ''لالہ رخ'' اہمیت کے حامل ہیں۔ میر ایوب میر اپنے افسانوں کے ذریعے معاشرہ کو بدلنے کی وکالت کرتے ہیں۔ ''ٹھنڈی آگ'' کے بعد ان کا ایک اور افسانوی مجموعہ ''اور پھر ایک دن'' شائع ہو چکے ہیں۔ مجید ارجمند کی کہانیوں کی زبان رواں دواں ہے ''ابابیلوں کی بستی'' ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔

ڈاکٹر ریاض توحیدی کے افسانوں میں کشمیر کا درد کرب، خون خراب اور ٹوٹتی ہوئی زندگی کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ ''کالے دیوؤں کا سایہ'' ان کا فسانوی مجموعہ حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ ان کے افسانے سے ایک اقتباس پیش ہے:

''وہ ایک آفت زدہ بستی تھی۔ وہاں طلوع آفتاب سے لیکر غروب

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

آفتاب تک جنازے اُٹھتے رہتے تھے۔ اس بستی میں موت کا رقص کئی برسوں سے جاری تھا۔ کبھی بچے نرم و نازک ہاتھوں سے اپنے بزگوں کی لاشوں پر مٹی ڈالتے اور کبھی بزرگ اپنے ناتواں کندھوں پر اپنے جوان بچوں کا جنازہ اُٹھاتے رہتے۔ ہر ایک اپنی مستعار زندگی کا فکر مند تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ کب، کہاں اور کیسے موت کی آغوش میں چلا جائے گا۔ ہر گلی سنسان اور ہر کوچہ ویران دکھائی دیتا، صرف قبرستان آباد ہو رہے تھے۔"[۱۸]

دیپک بدکی ریاست کی اردو افسانوی روایت میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں ان کے اب تک چار افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں "ادھورے چہرے"، "چنار کے نیچے"، "زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی"، "ریزہ ریزہ حیات" قابل ذکر ہیں۔ ان کے افسانوں کا مطالعہ کرتے وقت اکثر کہاوتوں کا سامنا ہوتا ہے جو صرف کشمیر نہیں بلکہ ہندوستان کی تہذیب تک لے جاتی ہیں جیسے:

"جب زیور ہوتے ہیں تو کان نہیں ہوتے اور جب کان ہوتے ہیں تو زیور نہیں ہوتے۔"[۱۹]

کشمیر کی صنعت و حرفت کا بھی ذکر کیا گیا ہے اور رواں دواں جبر و استحصال کا بھی ریکی سے مشاہدہ کیا ہے۔ ریزی ریزی میں شامل کہانیوں میں انہوں نے کشمیر کی کامیاب نظر کشی کی ہے مثلاً:

"ان برسوں کے دوران وادی ناسازگار حالات سے جھومتی رہی نہ ہوا میں وہ تازگی رہی اور نہ پانی میں وہ مٹھاس۔ ہوا میں بارود کی تیز بدبو ہوتی تھی جبکہ پانی میں شورے کی تیزابیت گھلی ہوئی تھی۔ مغل

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

باغات میں بھی وہ پہلی سی چہل پہل نہیں تھی اور نہ کھیتوں میں وہ مدھر گیت گونج رہے تھے۔ اگر کچھ تھا تو بس سونی سڑکیں، پولیس چوکیاں اور ڈرے سہمے لوگ۔''[۲۰]

سیدہ نکہت فاروق کا افسانوی مجموعہ ''قہر نیلے آسمان کا'' ہے اس میں شامل افسانوں میں وادی کے حالات کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ سیدہ نکہت شاعر بھی ہیں۔ ایک اہم نام جس کا ذکر اگر نہ ہو تو یہ مضمون ادھورا رہ جائے گا۔ اصل نام حبیب اللہ اور المعروف حامدی کاشمیری جو کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ اکتشافی تنقید ان کی پہچان ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک کامیاب شاعر اور افسانہ نگار بھی ہیں۔ اب تک ان کے چار افسانوی مجموعے ''وادی کے پھول''، ''سراب''، ''برف میں آگ'' او''رشہر افسوں'' چھپ چکے ہیں۔ حسن ساہو جن کا اصل نام غلام حسن ہے۔ چار افسانوی مجموعوں کے مالک ہیں ''پھول کا ماتم''، ''بستی بستی''، ''صحرا صحرا''، ''اندھا کنواں'' اور ''گردشِ دوراں'' قابل ذکر ہیں۔ کشمیری عوام کی بے کس زندگی، ان پر کئے جا رہے ظلم و جبر اور سیاست دانوں کی سازشیں وغیرہ ان کے افسانوں کے اہم موضوعات ہیں۔ مضمون کا اختتام پروفیسر قدوس جاوید کے اس نظریے سے کرتا ہوں ''ریاست کی نئی نسل سے تعلق رکھنے والے افسانہ نگاروں کی تخلیقات نے کشمیر میں زندگی جینے اور زندگی گزارنے کے عمل کے بیچ فرق کو سیال بنا دیا ہے۔ ان کے افسانے تصوراتی اور خیالی افسانے نہیں۔ کشمیر کی چشم پرخوں سے ٹپکنے والے لہو کے قطرے ہیں اور ہر قطرہ کرب والم کا ایک سمندر ہے جس کی لہروں کی نہ تو کوئی حد ہے اور نہ شمار۔''[۲۱]

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

حواشی

1۔ قدوس جاوید، پروفیسر: جموں وکشمیر میں اردو افسانہ کے بدلتے رجحان، جموں وکشمیر میں اردو افسانہ نمبر، ص 7۔

2۔ مشتاق حیدر، ڈاکٹر: کشمیر میں اردو، جموں وکشمیر میں اردو افسانہ نمبر، ص 66۔

3۔ نورشاہ : دلدل، ص 29

4۔ نورشاہ : ویرانے، ص 119۔

5۔ سلیم سالک : عمر مجید کے بہترین افسانے، مردہ چنار، ص 99۔

6۔ سلیم سالک : عمر مجید کے بہترین افسانے، شہر کا اغوا، 43۔

7۔ آنندلہر : سرحدوں کے اس پار، ص 12، ص 15، ص 31۔

10۔ آنندلہر : انحراف، ص 21، ص 16، ص 41، ص 57۔

14۔ خالد حسین : اشتہاروں والی حویلی، ص 40، ص 7۔

16۔ ترنم ریاض : یمبرزل، کشتی، ص 11۔

17۔ مشتاق احمد وانی : میٹھا زہر، ص 33۔

18۔ ریاض توحیدی، ڈاکٹر : جنازے، ص 33۔

19۔ دیپک بدکی : ریزہ ریزہ حیات، ساری کی ساری تمہاری، ص 127۔

20۔ دیپک بدکی : ریزہ ریزہ حیات، ص 48۔

21۔ قدوس جاوید، ڈاکٹر : جموں وکشمیر میں اردو افسانہ کے بدلے رجحان، جموں وکشمیر میں اردو افسانہ نمبر، ص 15۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں جموں وکشمیر کی اردو شاعرات

جموں وکشمیر میں اردو شاعری کے ابتدائی نقوش اُس وقت سے مل رہے ہیں جب سے شمالی ہند میں اردو شاعری کے آثار ملتے ہیں۔ بقول حافظ محمود شیرانی ''دلی میں ابھی اردو دبستان قائم ہی نہیں ہوا تھا کہ یہاں کے لوگوں نے اردو مثنویاں لکھنی شروع کر دی تھیں''۔ محمود شیرانی کے اس قول میں کس حد تک صداقت ہے یہ فیصلہ محققین حضرات کے حوالے کر دینا چاہیے لیکن اس قول سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ برصغیر کے دیگر علاقوں کے شانہ بہ شانہ جموں وکشمیر میں بھی شاعری پروان چڑھتی رہی ہے۔ لیکن جموں وکشمیر میں شاعری کی روایت سے متعلق اگر بات کریں یا متعدد سوالات کے جوابات کے لئے تحقیقی دلائل کو پیش کریں تو یہ ایک طویل بحث طلب موضوع ہے لہذا بہتر ہے کہ خاموشی اختیار کر کے اپنے روئے سخن کے متعلق بات کی جائے۔

جموں وکشمیر کی شعری روایت پر اگر طائرانہ نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ شاعرات کی تعداد مرد شعراء کے مقابلے قلیل ہے۔ ان شاعرات میں پہلی خاتون زینب بی بی محجوب (گلشن نعت)، شہزادی کلثوم، سلمٰی فردوس، عائشہ مستور اور عابدہ احمد ایسی شاعرات ہیں جنہوں نے تانیثی اور نسائی شعور کے ساتھ ساتھ اپنے جذبات واحساسات کو شعری جامہ

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

پہنایا ہے۔ اگر ہم بالخصوص اکیسویں صدی کی پہلی دہائی کا رخ کریں تو نگاہ فوراً پروفیسر نصرت آرا چودھری پر ٹھرتی ہے جو ایک ذہین شاعرہ تھیں۔ کم لکھنا اور اچھا لکھنا ان کی خاصیت تھی۔ نصرت آرا چودھری کی پیدائش ۱۹۵۷ء میں سرینگر میں ہوئی۔ یوں تو کئی دہائیوں سے لکھتی رہی ہیں لیکن اب تک ان کا صرف ایک ہی شعری مجموعہ ''ہتھیلی کا چاند'' کے نام سے ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا ہے۔ شاعری کے علاوہ انہوں نے فیض فہمی میں بھی اپنی انفرادی پہچان بنائی۔ ان کی تصانیف میں ''فیض کی شاعری۔۔۔ایک مطالعہ''، ''فیض احمد فیض۔۔۔روایت اور انفرادیت''، ''فیض احمد فیض اور جدید شعری ذہن'' کے علاوہ ''نبض افسانہ'' اردو ادب میں اہم کتابیں ہیں۔ ان کے شعری مجموعے ''ہتھیلی کا چاند'' میں ان کی غزلیں اور آزاد نظمیں شامل ہیں۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ غزل کی اچھی شاعرہ تھیں یا نظم کی لیکن یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ان کی غزلوں میں جدید رنگ و آہنگ۔ کے ساتھ ساتھ مابعد جدید شاعری کے عناصر بھی ملتے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنے تجربات و مشاہدات کو بڑی سچائی کے ساتھ غزل کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ نصرت چودھری صاحبہ نے اپنے شعری مجموعہ ''ہتھیلی کا چاند'' کے دیباچے میں خود لکھا ہے۔

> ''جہاں تک میری شاعری کا تعلق ہے، ہوسکتا ہے کچھ لوگوں کو یہ ضرورت سے زیادہ داخلی نظر آئے۔ لیکن ایک بات جس پر میں بجا طور پر فخر کرسکتی ہوں وہ ہے۔ میری شاعری کی سچائی۔ اس میں کوئی بناوٹ نہیں۔ کوئی چھل کپٹ یا ریا کاری نہیں۔ میں نے ہر احساس اور جذبے کو اپنی ذات کے حوالے سے دیکھا ہے۔ اور جو محسوس کیا ہے۔ اپنے محدود الفاظ کا سہارا لے کر انہیں پیش کر دیا ہے۔ میرے سبھی تجربات میں چاہئے آپ کو کوئی تنوع نظر نہ آئے۔ لیکن ان کی

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

بے ساختگی اور اظہار رائے کی آزادی یقیناً آپ کو متاثر کرے گی۔"......۱

مذکورہ بالا اقتباس میں انہوں نے اپنی شاعری کے امتیازت کی نشاندہی خود کی ہے۔اوران کی شاعری کے مطالعے سے ثابت بھی ہوتا ہے کہ اپنی شاعری سے متعلق ان کی وضاحتیں یادعوے غلط بھی نہیں ہیں۔اس کا اندازہ ان کے اشعار سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

جو لوگ کسی شے کی تمنا نہیں کرتے
خوابوں کے دریچے سے وہ جھانکا نہیں کرتے

جب مجھ سے ہم کلام میری خامشی ہوئی
بکھرے ہوئے وجود سے شرمندگی ہوئی

دُکھ دیتے دیتے اہلِ جہاں مجھ کو تھک گئے
اپنے غموں پہ اس لیے ہنستی رہی ہوں میں

نصرتؔ آرا نے ایک عورت ہونے کے ناطے عورت کی زندگی میں رونما ہونے والے واقعات کو سمجھا۔جس میں اس کا کرب بھی ہے، رنج بھی، اور نا اُمیدی بھی، دُکھ کے لمحوں میں بھی وہ نا اُمید نہیں ہونے دیتی بلکہ جینے کی اُمنگ پیدا کرتی تھیں۔انسان چاہیے زندگی کے کسی بھی مقام پر کیوں نہ پہنچ جائے اُس کے احساسات، جذبات ،اور تجربات ہمیشہ اس کے اپنے ہوتے ہیں اور انھیں استعمال کرنے کا طریقہ بھی اُس کا اپنا ہوتا ہے۔جس طرح ہر انسان کے ہاتھوں کی لکیروں کے نشان ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں اسی طرح اُن کے اظہار کرنے کا طریقہ بھی الگ ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ اظہار کا طریقہ تو بدل سکتا ہے مگر اس کا سلسلہ جاری وساری رہتا ہے۔نمونے کے

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

طور پر یہ اشعار پیش ہیں:

احساس کی رگوں سے ٹپکتا رہا لہو
ہم کو کسی سے پیار دوبارا نہ ہو سکا
میں شمعِ انتظار فروزاں کئے رہی
چاہت کا اُس طرف سے اشارہ نہ ہو سکا

☆☆☆

اُن سے مل پاؤں کبھی ایسا اشارہ مانگوں
میں سمندر میں کھڑی ہو کے کنارہ مانگوں
لمحہ لمحہ مجھے سولی پہ چڑھانے والو
تم سے کس منہ سے میں جینے کا سہارا مانگوں

نصرت چودھری نے جس طرح اپنی غزلوں میں رشتوں کو مدِ نظر رکھا اور اُن میں رونما ہونے والے واقعات کو بیان کیا اور عورت ذات کا استحصال، اس کی بے راہ روی، دردمندی، ذلت اور رسوائی کو اپنی غزلوں میں جس طرح بروئے کار لایا۔ ریاست کے حوالے سے بہت کم خواتین شاعرات نے اس بات کو مدِ نظر رکھا ہے حالاتِ حاضرہ پر نصرت چودھری کی نظر کافی گہری تھی۔ وہ جانتی تھیں کہ آئے دن اس زمین پر انسان کا خون کس طرح بڑی بے دردی سے بہایا جا رہا ہے۔ وہ ان حادثات اور واقعات کو دیکھ کر تڑپ اٹھتی تھیں زندگی کے غموں کو سہتے سہتے جب اُن کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے۔ تو یہ کہنے پر مجبور ہو جاتی ہیں کہ۔

جن پہ لکھے ہیں نام رشتوں کے
میرے سینے میں ایسے خنجر ہیں

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

روزِ محشر سے کیا ڈراتے ہو
میرے آنگن میں سارے محشر ہیں
اُن کے چہرے کو جب سے دیکھا ہے
آسماں چپ بُجھے سے اختر ہیں
جانے کیسے سفر میں ہوں نصرتؔ
سارے منظر اُداس منظر ہیں

نصرتؔ چودھری نے اگر چہ اپنی غزلوں میں موضوعات کے حوالے سے بحث کرنے کی کوشش کی ہے اور اُسے اپنی غزلوں میں برتا بھی ہے۔ جسکی وجہ سے اُن کا شمار ریاست میں اہمیت کا حامل ہے غزلوں کی طرف ان کا رجحان اگر چہ کم رہا ہے لیکن اس کے باوجود اُن کا شعری مجموعہ ''ہتھیلی کا چاند'' قابلِ اعتماد ہے۔ نصرتؔ چوہدری کے یہاں عصرِ حاضر کے شناختی امتیازات، تنہائی، ذات کا انتشار وجود کی شکستگی، زندگی کے بے معنی ہونے کا کرب، زمانے کی بے رُخی وغیرہ کا اظہار سکہ بند جدید شاعروں کی طرح فیشن کے انداز میں نہیں ہوا ہے۔ بلکہ یہ سارے عناصر نصرتؔ چوہدری کی غزلوں میں سچے تحقیقی تجربے، جذباتی وحسیاتی شعور اور تہذیب یافتہ کیفیت کے طور پر سامنے آئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نصرتؔ چوہدری کشمیر کی عصری سماجی وثقافتی صورتِ حال سے بھی اپنی غزلوں کے لیے تاروپود حاصل کرتی ہیں لیکن ان کا اظہار اپنی ذات کی گہرائیوں میں موجودہ منفرد لسانی، فکری، اور اسلوبیاتی رنگ وروش کے ساتھ کرتی ہیں۔ اسی لیے نصرتؔ چوہدری کی غزلوں کی فضا، عام طور پر رومانی اور نسوانی نظر آتی ہے۔ لیکن ان اشعار کی گہرائی میں جا کر غور کریں تو ان میں کشمیر کی ظاہری فضا اور عصری حالات اور رسائل کی عکاسی بھی نظر آئے گی۔ جس کی چند مثالیں درجہ ذیل ہیں۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

اپنی ہی گرمی سے جل کر اس طرح سوکھا چنار
دیکھتے ہی دیکھتے پھر ہو گیا تنہا چنار
جس کے سائے میں کسی نے پیار کا رستہ چنار
یاد آئے گا مجھے برسوں وہی اونچا چنار
لوگ دنیا کے عجائب دیکھ کر آئے تو ہیں
کس نے کیا دیکھا اگراب تک نہیں دیکھا چنار
دھوپ کی مسموم شدت سے وہ اندھا ہوگیا
جاگتی آنکھوں سے جس نے کٹتے دیکھا تھا چنار

ان کی شاعری میں جمالیاتی اور رومانوی پہلوؤں کی نشاندہی کرتے ہوئے ڈاکٹر مشتاق احمد وانی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''نصرت چودھری کی شاعری میں جمالیات، رومانیت اور نئی حسیت کے پرتو دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے نسائی لب و لہجے اور وارداتِ قلبی کے اظہار سے ایک مظلوم اور بے بس عورت کی داستان ترتیب پاتی ہے''۔[2]

نصرتؔ چودھری نے زیادہ تر آزاد نظم کی ہئیت میں نظمیں لکھی ہیں۔ نصرتؔ چودھری کے شعری مجموعہ ''ہتھیلی کا چاند'' میں کُل ستائیس نظمیں شامل ہیں جن میں زیادہ تر آزاد نظم کی شکل میں لکھی گئی ہیں۔ جن میں ''ہتھیلی کا چاند''، ''پاگل خواب''، ''زندگی''، ''زنجیر''، ''خود فریبی''، ''وفا''، ''دستک''، ''عید کا دن''، ''سِل''، ''آرزو''، ''قیدی''، ''سفر آئینہ کا''، ''گر وقت ملے تو میں''، ''برہن''، ''قیدی لمحے''، ''اللہ والی''، ''غم''، ''تم سچے تھے''، ''وہ لمحہ''، ''یاد کا چاند''، ''سچی کہانی''، ''چپ کے مکانوں کے

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

قیدی''، ''قیدی''، ''پھر کہو''، اور ''خالی کلائی'' قابلِ ذکر ہیں۔

ان کی آزاد نظموں سے ان کی نظموں کی خوبصورتی بڑھ جاتی ہے جس کی وجہ سے نئی نظم نگار خواتین میں ان کا مقام اہمیت کا حامل بن جاتا ہے۔ نصرتؔ آرا نے اپنی نظموں میں محرمیوں، ناکامیوں، اندیشوں اور حسرتوں کا ذکر کیا ہے۔ اپنی نظموں میں مشکل الفاظ کا استعمال نہیں کیا بلکہ عام بول چال کی سادہ زبان میں اتنی مٹھاس کا رس بھر دیتی تھیں کہ ہر دل عزیز کی زبان بن جاتی ہے۔ اُن کی نظموں میں ایک عورت کی ذاتی زندگی کے تجربات اور مشاہدات جلوہ گر ہیں۔ جس میں عورت کی زندگی میں پیش آنے والے مسائل کو منظرِ عام پر لایا گیا ہے۔

نصرتؔ کی ان نظموں میں چند ایسی نظمیں بھی شامل ہیں جن کو پڑھنے کے بعد درازوں سے ایک آہٹ دل میں اُتر کر خاموش اُداس چہرے سے یہ کہہ رہی ہو کے اگر وقت کی اس اندھی دوڑ میں فرصت ملے تو میری بھی سنو۔ ان نظموں کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ قاری سے ہم کلام ہوتی ہیں اور زندگی کے نگار خانے کی سیر کراتی ہیں۔ ازدواجی رشتے دونوں فریقین کی مرضی کے مطابق نہیں ہوتے تو اُن کی زندگی کس طرح اجیرن بن جاتی ہے۔ اس کے علاوہ بہت سی نظموں میں نسوانی کردار کی شکست وریخت کو نظمایا گیا ہے۔ نصرتؔ کی شاعری میں بغاوت بھی دیکھنے کو ملتی ہے لیکن وہ نعرے بازی کے انداز میں نہیں بلکہ پُر امن طریقے سے عورت کو بغاوت کی طرف متوجہ کرتی ہیں۔

جموں وکشمیر میں نسائی شاعری کے حوالے سے ایک اہم دستخط کی حیثیت کا نام رخسانہ جبیں کا بھی ہے۔ ان کی پیدائش ۱۹۵۵ء میں خواجہ بازار، سرینگر میں ہوئی۔ ان کی شاعری میں غزلیں اور نظمیں ساتھ ساتھ ملتی ہیں۔ رخسانہ جبیں ایک تعلیم یافتہ خاتون (ایم۔اے۔اردو۔ایم۔اے، فارسی، ایم۔فل، فارسی) ہیں اور ساتھ ہی ریڈیو کی ملازمت

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

کی وجہ سے ریاستی، ملکی اور بین الاقوامی حالات کی بھی معلومات رکھتی ہیں۔ لہٰذا یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ زبان، لب ولہجہ اور فکر وخیال کے اعتبار سے ان کی غزلوں کو مابعد جدید غزل کا نام دیا جاسکتا ہے۔ رخسانہ جبیں کا ابھی تک کوئی مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا ہے لیکن ان کی غزلیں اور نظمیں ادبی رسالوں میں چھپتی رہتی ہیں۔

ریاست میں اکیسویں صدی کی شاعرات کی شاعری کا رنگ وآہنگ ان سے ملتا جاتا ہے۔ لیکن مابعد جدید شاعرات کے طور پر اپنے عورت ہونے کی بنا پر عورت کے مظلوم ہونے کے احساس کو ہر وقت لادے نہیں رہتیں۔ ان کی اکثر وبیشتر غزلیں ایسی ہیں جو انھوں نے ایک آزاد، باشعور اور حساس کے طور پر لکھی ہیں۔ نصرت چودھری کے بعد اس کی عمدہ مثالیں رخسانہ جبیں کے یہاں ملتی ہیں مثلاً۔

ہمارے شہر پہ اب کس کی حکمرانی ہے
کہ آفتاب فسانہ ، کرن کہانی ہے
ہمارے زخم نہ آنسو ہی دیکھے جاتے ہیں
وہ مہرباں ہے تو کیوں حکمِ بے زبانی ہے

☆☆☆

بدلی رُت کے تقاضوں سے تو پریشاں ہے
میں مطمئین ہوں خدا نے مزاج سادہ دیا

☆☆☆

بس اتنا کافی ہے اب بھی زمین ہے زیرِ قدم
ستارے، شمس وقمر سب بھلا دیئے میں نے

رخسانہ جبیں کی شاعری کی بنیادی خوبی ان کی سادگی ہی ہے۔ عام طور پر وہ پیچیدہ

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

اور مبہم علامتوں اور استعاروں کے استعمال سے پرہیز کرتی ہیں اور جو علامتیں وہ لاتی ہیں ان کا سماجی اور تہذیبی پس منظر قاری کی سمجھ میں آتا ہے۔اس اعتبار سے رُخسانہ جبیں کی غزلیں اور نظمیں موجودہ عہد کی غزل کی سادگی اور سہل بیانی کی عمدہ مثال کہی جاسکتی ہیں۔

رُخسانہ جبیں نے اپنی ذات کے حوالے سے محسوسات کا اظہار تو کیا ہی ہے ان محسوسات کے پردے میں زندگی اور زمانہ کی بے وفائی کا شکوہ بھی کیا ہے رُخسانہ جبیں کا انداز بیان وہی ہے جو دوسرے موجودہ عہد کے شعراء کا ہے لیکن رخسانہ جبیں نے چونکہ اپنی غزلوں میں تانیثی سوچ اور فکر کے عناصر بھی محسوس یا نامحسوسانہ طور پر شامل کیۓ ہیں اس لیے رُخسانہ کی شاعری میں ایک ندرت پیدا ہوگئی ہے مثلاً

یہ احوال پُرسی زباں کھینچ کر
نہ رکھ دے کہیں میری جاں کھینچ کر

☆☆

کچھ ایسی اُس نے اب اپنے دِل میں ٹھانی ہے
ہمیں بھی درد کی دنیا الگ بسانی ہے

☆☆

ہمارے شہر پہ اب کس کی حکمرانی ہے
کہ آفتاب فسانہ کرن کہانی ہے

☆☆

جدا ہوئے تو ملاقات بھی نہیں ہوگی
گذرتے وقت کے دریا میں وہ روانی ہے

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

رخسانہ جبین کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد فرید پربتی اپنے ایک مضمون میں یوں رقمطراز ہیں۔

''ان کی شاعری میں فنی ارتکاز اور فکری تجدد کے ساتھ ساتھ عصری آگہی کے عمدہ نمونے بھی ملتے ہیں۔ وہ اپنی شاعری کو اعترافی رویوں تک ہی محدود نہیں رکھتی ہیں بلکہ دیگر تجربات سے بھی اپنی شعری کائنات مزین کرتی ہیں۔[۳]''

سیدہ نسرین نقاش کی پیدائش سرینگر میں ہوئی۔ ایم۔اے جرنلزم اور ایم۔اے پولٹکل سائنس میں کی۔ ان کے اب تک چار شعری مجموعے ''دشت تنہائی''، ''روحیں جناب کی''، ''تنہائیاں''، ''لہو پکار رہا ہے'' منظر عام پر آکر مقبولیت حاصل کر چکے اور اس امر کا ثبوت ہیں کہ سیدہ نسرین ریاست میں نسائی شاعری کے حوالے سے ایک فعال شاعرہ ہیں جنہوں نے زندگی کے متعدد تجربات کو نہات خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ نمونے کے طور پر چند اشعار پیش ہیں:

سورج فلک سے ٹوٹ کے دریا میں گر پڑا
شعلوں میں جل رہا تھا جو صدیوں کی پیاس سے

اے زندگی نہ گذرنا ہماری گلیوں سے
ابھی ہمارے جنازے گھروں میں رکھے ہیں

ان کی شاعری میں طنزیہ پہلو کے ساتھ ساتھ تیکھا پن اور انا پرستی کے کئی نقوش ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر دیکھئے:

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

وہ کیا ظلمتوں میں اُجالے کریں گے
یہ بجھے چراغوں کے بس میں نہیں ہے

جواز کیا دیں عدالت کو بے گناہی کا
ہمارے فیصلے دانشوروں میں رکھے ہیں

بس ایک بار ہی دیکھا تھا تجھ کو غیر کے سنگ
پلٹ کے پھر نہیں دیکھا تیری گلی کی طرف

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی نے اپنے ایک مضمون میں سیدہ نسرین نقاش کے حوالے سے یوں لکھا ہے:

''اُن کی شاعری لاشخصیت اور معروضیت کا انحرافیہ کہی جاسکتی ہے کیونکہ انہوں نے تمام تر شخصی اظہار کے ذریعے ایک ایسے نسوائی کردار کو خلق کیا ہے جو اپنی امتیازی پہچان اور منفرد ذہنی رویئے کا حامل ہے۔''[۲۴]

ترنّم ریاض کی پیدائش ۹ اگست ۱۹۶۳ء کو سری نگر میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام چودھری محمد اختر تھا۔ کشمیر میں پیدائش ہونے کے سبب ان کی مادری زبان بھی کشمیری ہے ۔ اِس کے علاوہ اُردو، انگریزی، پنجابی اور پٹھانی پر بھی فوقیت حاصل ہے۔ ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۷۵ء میں ہوا، تب سے لے کر آج تک وہ مسلسل لکھ رہی ہیں۔ وہ نہ صرف ایک شاعرہ ہیں بلکہ ایک اچھی افسانہ نگار، محقق، اور نقاد بھی ہیں۔ ان کے شریکِ حیات پروفیسر ریاض پنجابی سابق وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی، ایک باکمال عالم، مفکر اور افسانہ

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

نگار ہیں، جن کے افسانے وقتاً فوقتاً ماہنامہ شب خون (الہ آباد) سے شائع ہوتے رہے ہیں۔ ترنم ریاض نے جموں وکشمیر میں اکیسوی صدی میں اُردو فکشن کے ساتھ ساتھ اُردو شاعری کو بھی فروغ بخشا ہے۔

ترنم ریاض کی شاعری کو پڑھنے سے ایسا لگتا ہے کہ جیسے وہ ایک معتبر اور سنجیدہ دل کی آواز ہیں۔ اپنے دل کے اندر زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں جس میں نہ تصنع اور نہ اکہرا پن پایا جاتا ہے۔ بلکہ نسوانی پہلوؤں کی عکاسی کرتی ہیں۔ انسانی جذبات واحسات کو ترنم ریاض نے غزلوں اور نظموں میں لطافت اور شگفتگی کے ساتھ برتا ہے۔ زندگی کی تمام پریشانیوں کو دیکھتی اور محسوس بھی کرتی ہیں اور اپنے جذبات واحساسات کو تمام طریقوں سے جانچتی بھی ہیں۔

ترنم ریاض کے شعری مجموعے ''پرانی کتابوں کی خوشبو'' میں غزلوں کے ساتھ ساتھ نظمیں بھی شامل ہیں۔ ان کی چند نظمیں ''گھر''، ''منظر''، ''بچپن''، ''سمی الدّعا''، اور ''وجود'' ہیں، جن میں وہ بڑے خوبصورت انداز سے اپنے خیالات قلم بند کرتی ہیں۔

ترنم ریاض کی نظم 'گھر' میں جس طرح کا انداز اپنایا گیا ہے اس سے گھر کی پوری حقیقت ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ اس نظم میں گھر کے آنگن کا پورا ماحول آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔ ہر مردوزن کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے گھر میں خوشی اور پیار ومحبت سے زندگی بسر کرے۔ ترنم کا گھر اس لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے جس میں ایک طرف بلبلیں نغمہ خواں ہیں تو دوسری طرف پھولوں کی کیاریاں شادابی، شبنم کے قطرے ٹھنڈک اور ذہنی آسودگی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ گویا شاعرہ نے جس گھر کا نقشہ تیار کیا ہے وہ عملی صورت میں اپنے تمام جمالیاتی پیکر لئے ایک حسین منظر کی صورت اس کے سامنے ہے جس میں رہتے ہوئے وہ کافی مطمئن نظر آتی ہیں۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

جہاں تک ترنم ریاض نے عصری حالات میں منہدم ہوتی انسانی اقدار اور سفا کانہ قوتوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے تو وہیں فطری طاقتوں کے آگے انسان کی بے بسی کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ اسے اپنی زندگی کی یادیں تڑپانے لگتی ہیں۔ ترنم نے ایک نظم ''بچپن'' میں سحر جگایا ہے۔ نظم کا بند ملاحظہ ہو۔

چلا آ!

اے میرے بچپن

آجا لوٹ کر

باہوں میں میرے

لے کر وہ میری گڑیا

ہر انسان کی زندگی کے ساتھ بچپن کی کچھ یادیں ہمیشہ کے لئے جڑی ہوتی ہیں جنھیں وہ بار بار یاد کر کے اپنے بیتے ہوئے لمحوں کو یاد کرتا ہے۔ یہ انسانی زندگی کا وہ اسٹیج ہوتا ہے جسے بے فکری اور مستانگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ انسان اگر لاکھ کوشش کرے وہ اپنے بچپن کے گزرے ہوئے دنوں کو بھلائے نہیں بھول سکتا۔ ترنم ریاض کی نظم بچپن ان کے لئے ایک تلخ یاد بن کر رہ گئی ہے۔ وہ بچپن کی طرف لوٹ جانے کی حسرت کرتی ہیں مگر زندگی کے کچھ ایسے اصول بھی ہیں کہ اگر کچھ چیزیں ایک بار چلی جائیں تو وہ لوٹ کر واپس نہیں آتیں چاہے اس کے لئے انسان لاکھ کوشش ہی کیوں نہ کرے۔ انسان دنیا میں تمناؤں اور آرزوؤں کے سہارے زندگی گذارتا ہے۔ وہ اپنی آرزوؤں کی تکمیل کی خاطر ہر ممکن کوشش کرتا ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ ہر انسان کی آرزوئیں پوری ہوں۔ کافی حد تک انسان کی اس جبلی خواہش میں اس کی امیدوں کا بھی دخل ضروری ہوتا ہے جس کی بنا پر وہ ہر وقت حرکت میں رہتا ہے۔ ترنم ریاض کا معاملہ بھی کچھ اسی طرح کا ہے۔ کبھی وہ ماضی کی حسین وادیوں میں

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

کھونا چاہتی ہیں تا کہ پل بھر کے لئے سکون حاصل کر سکیں۔اس سلسلے میں ان کی نظم ''منظر'' کے چند بند ملاحظہ ہوں کیجیے۔

نرم کمبل میں سمٹی
میں لیٹی رہوں
شب کا اک پہر
بند پلکوں پہ منظر کو دیکھا کروں

ترنّم ریاض کی شاعری میں عورت کی زندگی کے کئی مسائل نظر آتے ہیں۔ وہ عورت ذات کی ہر وقت نمائندگی کرتی نظر آتی ہیں انھیں عورتوں کی عظمت اور خوبیوں کا احساس ہے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ترنّم ریاض نے جو بھی شاعری کی۔اُس میں ایک عورت کے درد و کرب اور اضطراب کی شاعری کا عکس ملتا ہے۔ان کی لکھی گئی اکثر غزلوں میں مایوس کُن حالات کی عکاسی ملتی ہے اُن کی غزل کا ایک شعر دیکھئے۔

روح سے ٹپکے لہو آنکھ سے پانی برسے
میں نے سوچا ہی نہ تھا جاتے ہیں بچے گھر سے

جموں وکشمیر کی شاعرات میں شبنم عشائی کا شمار بھی ہوتا ہے۔ شبنم عشائی کی پیدائش کشمیر کے ایک قصبہ تا پر پٹن میں ایک جاگیردارانہ گھرانے میں ۱۲ اپریل ۱۹۶۲ء میں ہوئی۔ شبنم عشائی بچپن سے ہی کافی ذہین تھیں آس پاس کے ماحول کے ساتھ ساتھ اپنے اردِ گرد کے ماحول پر نظر دوڑائی تو پتہ چلا کہ زندگی تو کچھ بھی نہیں ہے۔اور سماج میں عورت ذات کو کس مقام پے رکھا گیا ہے اس موضوع کے حوالے سے اُنھوں نے ''بیگانگی کے وجودی نظریہ'' پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔اُن کا اوّلین

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

شعری مجموعہ ''اکیلی'' جو ۱۹۹۹ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اور ۲۰۰۰ء میں اُن کی نظموں کا انتخاب ''میں سوچتی ہوں'' شائع ہوا ۲۰۰۲ء میں ان کی اردو ہندی رسم الخط میں نظمیں ''من بانی'' کے نام سے منظر عام پر آئی۔ اور جنوری ۲۰۰۸ء میں اُن کی نظموں کا ایک اور مجموعہ ''کتھارسس'' کے نام سے شائع ہوا۔ شبنم عشائی کی شاعری میں کافی حد تک عارفہ کی شاعری کے عکس نظر آتے ہیں۔ عورت ذات پر ظلم، اُس کی سسکیاں، درد و کرب کے عالم میں ہو رہے تشدّد کے بارے میں شبنم عشائی نے جس طرح پیش کیا ہے۔ اس طرح کا انداز ریاست کی شاعرات میں بہت کم ملتا ہے۔

شبنم کی شاعری ایک ایسی خاتون کی شاعری ہے جو نسوانی جذبات واحساسات، درد و کرب، اور زندگی کے نشیب وفراز کا گہرا شعور رکھتی ہیں۔ حسن وعشق اور زندگی کے اس سلسلے میں کیا کچھ باقی رہتا ہے اس کا اندازہ کسی کو بھی نہیں ہے اس سانحے کو انھوں نے اپنی نظموں میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے اس سلسلے میں اُن کی یہ نظمیں ملاحظ کیجئے:۔

آدھی رات
کوئی میری زمین پر اُترتا ہے
روشنیاں بکھرتا ہے
جھلتی دھوپ میں
تجھے
دیکھ کے
یوں لگتا ہے
جیسے
چاند اُترا ہو

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

تمہاری

باہوں کے چھوٹے سے حصار میں

مجموعی طور پر شبنم عشائی نے اپنی شاعری کے ذریعے اپنی پر شکوہ لہجے میں کہیں تو مرد معاشرے کے مسائل کو پیش کیا ہے تو کہیں عورت ذات کو شعور اور آ گہی کا درس بھی دیتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

ایک اہم نام جس کے ذکر کے بغیر بات ادھوری رہ سکتی ہے وہ نام روبینہ میر کا ہے۔ ادبی دنیا کے سفر میں انہوں نے اکیسویں صدی کی دوسری دہائی ہیں قدم رکھا۔ روبینہ میر کا شعری مجموعہ ''آئینہ خیال'' ۲۰۱۳ء میں شائع ہوا۔ جس میں انہوں نے تصوف کے علاوہ غزلوں اور نظموں میں نسوانی احساسات وجذبات کا اظہار کیا ہے۔ مشتاق احمد وانی کی زبان میں روبینہ میر کی شاعری اعلیٰ قدروں کی آئینہ دار ہے۔ مذکور شاعرات کے علاوہ شیفتہ پروین، مدثر لالی (بکھرے لمحے)، درخشاں اندرابی، روحی جان، واجدہ تبسم وغیرہ اپنے تخلیقی وجدان کی بنیاد پر زندگی اور سماج کے تمام پہلوؤں کو شعری منظر نامے میں پیش کرنے میں ہمہ جہت ہیں

حواشی:۔

۱۔ نصرت آرا چودھری، پروفیسر : ہتھیلی کا چاند، ۲۰۰۴ء (پیش لفظ)۔

۲۔ مشتاق احمد وانی، ڈاکٹر : مضموں، مطبوعہ، شیرازہ، ص ۲۰۲، ۴، ص ۲۰۳۔

۳۔ فرید پربتی، : مضمون، مطبوعہ، ترسیل، شمارہ نمبر ۹، ۲۰۱۱ء، ص ۱۳۰۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کے ادبی کارنامے

جموں وکشمیر کے ادبی افق کے دیدہ ور نقاد اور کہانی کار ڈاکٹر مشتاق احمد وانی ۳ مارچ ۱۹۶۰ء میں تحصیل وضلع ڈوڈہ میں پیدا ہوئے۔ ایم اے اردو کے بعد پی۔ ایچ۔ ڈی بموضوع ''تقسیم کے بعد اردو ناول میں تہذیبی بحران'' مکمل کی۔ اہم بات یہ ہے کہ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی جموں وکشمیر کے واحد ایسے اردو اسکالر ہیں جنہیں ڈی لٹ (روہیل کھنڈ یونیورسٹی بریلی، یوپی) نے تفویض کی۔ آپ پہلے شاعری کی طرف راغب ہوئے بعد میں نثر کی طرف رخ کیا۔ ظاہر اردو افسانہ نثری ادب میں سب سے زیادہ مقبولیت کرنے والی صنف ہے اور اکثر پڑھے لکھے اہل حضرات اردو افسانہ میں طبع آزمائی کرنا فخر سمجھتے ہیں۔ ایک تخلیق کار اپنی تخلیقیت کے لئے اپنی ذات سے لیکر پوری کائنات کے مسائل و واقعات سے متاثر ہوتا ہے۔ جس دور یا ماحول میں وہ اپنی زندگی جیتا ہے اس ماحول کی بازگشت اس کی تخلیق میں سنائی دیتی ہے۔ جموں وکشمیر کے معاصر اردو افسانہ نگاروں کی تخلیقات کا مطالعہ کریں تو عصری دور کے لکھنے والوں نے نئی تلاش اور نئی بصیرت کا منظر نامہ سامنے لایا ہے جس کا موضوعاتی دائرہ کار کافی وسیع ہے۔ ان افسانہ نگاروں نے جس کامیابی سے اپنے خارجی تجربات ومشاہدات اور اپنے داخلی جذبات واحساسات کے اظہار و بیان

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

کے لئے فنی شرائط کا استعمال کیا ہے اس سے ایک مخصوص عہد کا معیار اور مزاج متشکل ہوتا ہے۔نور شاہ، ترنم ریاض، حامدی کاشمیری، آنند لہر، خالد حسین، آمین بنجارہ، وید راہی، مشتاق احمد وانی، ولی محمد، حسن ساہو، ڈاکٹر ظہور الدین، وریندر پٹواری، جان محمد آزاد، غلام نبی شاہد، دیپک بدکی، ذنفر کھوکھر، منصور احمد منصور، پرویز مانوس، شیخ خالد کرار، ریاض توحیدی اور غنی غیور وغیرہ کے علاوہ بھی کئی کامیاب افسانہ نگار اس روایت کو خون جگر سے سینچ رہے ہیں۔جموں و کشمیر کے موجودہ دور کے افسانہ نگاروں میں ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کا نام اہمیت کا حامل ہے۔اُردو افسانہ نگاری میں انکی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ان کی شخصیت اپنے ادبی، سیاسی اور سماجی کارناموں کے باعث قائم رہی ہے اور آئیندہ بھی رہے گی۔بچپن ہی سے وہ کافی ذہین اور خوش اخلاق شخص ہیں۔اب تک ان کے دو افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔پہلا افسانوی مجموعہ ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا جس کا نام ''ہزاروں غم'' ہے۔اس میں سولہ کہانیاں شامل ہیں۔اس افسانوی مجموعے کو ادبی حلقوں میں کافی شہرت حاصل ہوئی۔اس کے بعد ۲۰۰۸ء میں ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''میٹھا زہر'' کے عنوان سے منظر عام پر آیا۔اس افسانوی مجموعے میں کل بارہ کہانیاں شامل تھی۔یہ افسانوی مجموعہ پہلے افسانوی مجموعے سے بالکل الگ ہے۔یہ افسانوی مجموعہ تقریباً تمام بڑے فکشن کے اہم نقادوں کی نظر سے گزرا ہے اور تمام افراد نے اس کا جائزہ لیا اور اپنے اپنے تاثرات پیش کیے ہیں۔

مشتاق احمد وانی کے افسانوں کا جائزہ لینے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اُنہوں نے اپنے گرد و نواح کی زندگی کے حوادث اور واقعات کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔اُنہوں نے گھسے پٹے موضوعات پر افسانے نہیں لکھے بلکہ نئے موضوعات کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔انسانی زندگی کی عکاسی وہ بڑی بے باکی کے ساتھ کرتے ہیں۔سیدھی

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

سادھی زندگی کی کہانی کو وہ بڑے موثر انداز کے ساتھ سادہ پلاٹ اور سادہ زبان میں پیش کرتے ہیں۔ان کے افسانوں میں ہمیں اپنی جموں وکشمیر کا عکس نظر آتا ہے۔یہاں کا موسم، یہاں کی بہاریں، یہاں کی افراتفری ان کے افسانوں میں ہمیں ملتی ہے۔سیدھی سادھی زبان میں بہت بڑی بات کہنے کا ہنر مشتاق احمد وانی کو خوب آتا ہے اور یہی بات افسانے کے حسن کو دوبالا کر دیتی ہے۔مشتاق احمد وانی ریاست جموں وکشمیر کے وہ نوجوان ادیب ہیں جنہوں نے قلیل مدت میں ریاست کے ادبی حلقوں میں اپنی الگ شناخت بنائی ہے۔ان کے افسانوں سے متعلق نامور نقاد پروفیسر گوپی چند نارنگ یوں رقمطراز ہیں۔

> ''ڈاکٹر مشتاق احمد وانی ایک مدت سے کہانیاں لکھ رہے ہیں۔وقتاً فوقتاً ان کی کہانیاں میری نگاہ سے گذرتی رہتی ہیں وہ ایک دردمند اور احساس طبعیت رکھتے ہیں۔وہ کشمیری اہل زبان ہیں لیکن اُردو میں بھی ان کی پیٹھ مادری زبان سے کم نہیں۔ان کی اُنگلیاں معاشرے کی نبض پر ہیں اور ان کی کہانیاں آج کے مسائل کے گرد گھومتی ہیں۔وہ افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک تنقید نگار اور محقق بھی ہیں ان کی ان تصانیف میں ''تقسیم کے بعد ناول میں تہذیبی بحراں'' جو ۲۰۰۲ء میں منظر عام پر آئی اور دوسری '' آئینہ آئینہ'' ۲۰۰۸ء میں شائع ہوئی۔ان کی دوسری تصانیف میں اعتبار ومعیار، شعور بصیرت اور اُردو ادب میں تانیثیت منظر عام پر آکر یہ ثابت کرتی ہیں کہ وہ تحقیق اور تنقید کا بھی شعور رکھتے ہیں۔اب تک مشتاق احمد وانی کی ان کوششوں سے اُردو ادب میں گراں قدر اضافہ ہوا ہے۔''[1]

تحقیق وتنقید کے لئے زبان وادب کی روایات اور رجحانات، اقدار اور نظریات

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

کے گہرے شعور کے ساتھ ساتھ صبر وسکون ریاضت اور ادب سے بے لوث وابستگی بھی ضروری ہے۔ یہ صفت کشمیر کے معاصر محققین اور ناقدین میں سب سے زیادہ ڈاکٹر مشتاق وانی کے یہاں نظر آتی ہے۔ مشتاق وانی گذشتہ تین دہائیوں سے ادب کے مختلف شعبوں میں اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ ایک عرصہ تک مشتاق وانی کی شناخت بطورِ افسانہ نگار کی جاتی رہی ہے۔ لیکن ۲۰۰۰ء تک آتے آتے انھیں اور کشمیر کے اُردو قارئین کو بھی اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ مشتاق احمد وانی طبعاً و مزاجاً تحقیق و تنقید کے مردِ میدان ہیں۔ ان کی تصنیف ''تقسیم کے بعد اُردو ناول میں تہذیبی بحران'' نے اس خیال کی تصدیق بھی کر دی۔

''تقسیم کے بعد اُردو ناول میں تہذیبی بحران'' (۲۰۰۲ء) میں شائع ہوئی گرچہ یہ مقالہ مشتاق احمد وانی نے شعبہ اُردو جموں یونی ورسٹی کے ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لیے لکھا تھا لیکن اپنے موضوع کی انفرادیت اور ترتیب اور پیشکش کے اعتبار سے یہ مقالہ یونی ورسٹیوں میں لکھے جانے والے مقالوں سے بہت منفرد بھی ہے اور ممتاز بھی۔ پروفیسر شمیم حنفی نے مشتاق احمد وانی کے اس تحقیقی و تنقیدی مقالہ کے بارے میں درست لکھا ہے کہ۔

> ''وہ متانت ملتی ہے جو سنجیدہ مطالعے کے بغیر ہاتھ نہیں آتی۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی یہ کتاب شوق سے پڑھی جائے گی اور فکشن سے شغف رکھنے والے اس کی قدر کریں گے۔'' ۲

مشتاق وانی کے مذکورہ بالا تحقیقی و تنقیدی کارنامے کی اہمیت اور معنویت کا اعتراف کرتے ہوئے مشہور نقاد اور دانشور پروفیسر عبیدالرحمٰن ہاشمی نے کتاب کے 'پیش لفظ' میں لکھا ہے۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

''ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کی موجودہ کوشش اس لحاظ سے قابلِ قدر ہے
کہ اس کے وسیلے سے اُردو ناول کی عہد بہ عہد بدلتی ہوئی صورت
حال کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور خصوصاً آزادی کے بعد زندگی کے رزم
نامے میں ناول کے خصوصی کردار اور عمل کو بھی دیکھا اور سمجھا جا سکتا
ہے۔ یوں تہذیبی بحران یہاں قدرے غلط فہمی کو ضرور راہ دیتا ہے اس
لیے کہ مصنف کا مقصد تہذیب (culture) کے حوالے سے تاریخی
نقوش کو نشان زد کرنے کے بجائے سیاسی و سماجی سطح پر اخلاقی اور
معاشرتی زندگی میں پیدا ہونے والے خلفشار کی نشان دہی کرنا ہے۔
چنانچہ انہوں نے گذشتہ پچاس برسوں میں ممتاز ترین فکشن کے
کارناموں کو بحث کا موضوع بناتے ہوئے اُن کے فنی وفکری تجزیے
سے جو نتائج اخذ کئے ہیں وہ تعمیر کی صحت اور استدلال کی مضبوطی
کے سبب ہمیں قائل مطمئن کرتے ہیں'' [۳]

اُردو میں غزل اور افسانہ کے بعد سب سے مقبول صنف ناول ہے۔ اُردو ناول کی تاریخ وتنقید کے حوالے سے پریم چند، علی عباس حسینی، حسن فاروقی اور وقار عظیم سے لے کر پروفیسر ارتضٰی کریم، اسلم آزاد اور پروفیسر انور پاشا تک نے بہت کچھ لکھا ہے لیکن اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں ہندوستانی تہذیب وتمدن پر مغربی تہذیب وتمدن اور علوم وفنون کے سبب، متحدہ ہندوستان میں جو تہذیبی بحران پیدا ہوا اسے کسی اور محقق اور نقاد نے ایک مستقل موضوع کے طور پر پیش نہیں کیا ہے اور نہ ہی خصوصیت کے ساتھ اُردو کے ابتدائی ناولوں سے لے کر عصر حاضر تک کے ناولوں میں اس تہذیبی کشمکش انتشاء اور بحران کی واضح نشاندہی کی ہے۔ حالانکہ ڈپٹی نذیر احمد، رتن ناتھ سرشار، مرزا ہادی رسوؔا اور پریم چند سے لے کر سجاد

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

ظہیر، عزیز احمد اور عصمت چغتائی تک اور قرۃ العین حیدر اور جوگندر پال سے لے کر عبدالصمد، الیاس احمد گدی، حسین الحق، مشرف عالم ذوقی اور سید محمد اشرف تک اُردو کے تمام ناول نگاروں نے عہد بہ عہد رونما ہونے والے سماجی، سیاسی، معاشی اور تہذیبی تبدیلیوں اور اُتار چڑھاو کا کہیں اشاراتی تو کہیں وضاحتی اسلوب میں اظہار خیال تو کیا ہے اور اسی لئے اُردو ناول کو زندگی کا ترجمان اور عکاس بھی کہا جاتا ہے لیکن اُردو ناول میں اقوامِ عالم میں تہذیبی بحران کے حوالے سے مشرق خصوصاً ہندوستان اور پاکستان میں رونما ہونے والے تہذیبی بحران کی عکاسی کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ پہلی بار مشتاق احمد وانی نے ہی پیش کیا ہے۔ اس ضمن میں مشتاق وانی نے سائنسی انقلاب، صنعتی انقلاب، انقلابِ فرانس و روس کے عالمی اثرات کا بھی جائزہ پیش کیا ہے اور ساتھ ہی مارکسؔ، فرائڈؔ اور درخیمؔ جیسے فلسفیوں کے نظریات کے ترقی پذیر ممالک کے عوام اور علوم وفنون پر پڑنے والے اثرات کی بھی نشاندہی کی ہے۔ اُردو کے کلاسیکی ناولوں، فسانۂ آزاد اور اُمراؤ جان وغیرہ میں بھی تہذیبی بحران کی عکاسی پر روشنی ڈالنے کے بعد مشتاق وانی نے جدید دور کے ناولوں میں تہذیبی بحران کی نشاندہی کرتے ہوئے اپنے تحقیقی وتنقیدی رویوں کا مظاہرہ جس بصیرت مندی کے ساتھ کیا ہے اس کا اندازہ مذکورہ بالا کتاب ''تقسیم کے بعد اُردو ناولوں میں تہذیبی بحران'' سے ماخوذ ان کے درج ذیل اقتباس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

> ''۱۹۴۷ء کے بعد اُردو میں موضوعاتی اعتبار سے نہ صرف سماج کے گرتے ہوئے ملبے کو پیش کیا گیا ہے بلکہ ہیئتی اعتبار سے بھی ناول کے فرسودہ اصولوں سے انحراف کرنے کو اہمیت دی گئی اور اس چیز کی خاص طور پر کئی ادیبوں کو ضرورت محسوس ہوئی کہ موضوع کے ساتھ ناول کی ہئیت کو بھی بدلا جائے۔ چنانچہ اب کہانی کو سیدھے اور سپاٹ

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

انداز میں آگے بڑھانے کے بجائے اُسے پیچیدہ راستوں سے آگے بڑھانے کی کوشش کی گئی۔ حلقۂ اربابِ ذوق کے زیرِ اثر علامتی کہانیوں اور علامتی ادب کی تخلیق کا سلسلہ شروع ہوا اور ترقی پسند نے ''شعور کی رو'' کو اپنا کر تخلیقی ادب میں مزید پیچیدگیاں پیدا کر دیں اور انہیں تحریکوں کے زیرِ اثر سجاد ظہیر کی ناولٹ ''لندن کی ایک رات'' اور عزیز احمد کا ناول ''گریز'' منظرِ عام پر آئے۔'' ۴؎

مشتاق احمد وانی نے اپنے تحقیقی وتنقیدی مضامین لکھنے کا سلسلہ مسلسل جاری رکھا۔ ۲۰۰۴ء میں ان کے مضامین کا ایک مجموعہ ''آئینہ آئینہ'' کے نام سے شائع ہو کر قبولیتِ عام حاصل کر چکا ہے۔ تحقیقی وتنقیدی مضامین کے دو مجموعے ''شعور بصیرت'' اور ''افہام وتفہیم زبان وادب'' بھی اسی دوران شائع ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کا تازہ ترین تحقیقی و تنقیدی کارنامہ ''اُردو ادب میں تانیثیت'' ہے۔ ۷۸۰ صفحات پر مشتمل یہ تصنیف، تانیثیت کے موضوع پر پہلی جامع تصنیف ہے۔ جس میں مابعد جدیدیت کی ایک اہم شق تانیثیت Feminism کا ایک سماجی وثقافتی رویہ اور علمی وادبی رجحان کی حیثیت سے تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ لیکن مشتاق احمد وانی نے اپنی اس ضخیم تصنیف میں تنقیدی بصیرت سے کم اور جذباتی خیالات سے زیادہ کام لیا ہے۔ انہوں نے تانیثیت کے معنی ومفہوم کی وضاحت مغربی دانشوروں کے فرمودات کے حوالے سے کی ہے۔ عالمی پیمانے پر تانیثیت کے رجحان کے آغاز وارتقاء کی تاریخ انہوں نے تفصیل کے ساتھ پیش کی ہے جن سے مابعد جدید تصورِ ادب سے واقفیت رکھنے والے ناقدین اور باذوق قارئین واقف ہیں۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ، عتیق اللہ، نظام صدیقی، ابوالکلام قاسمی اور قدوس جاوید وغیرہ نے تانیثیت پر بہت کچھ لکھا ہے۔ خود خواتین میں شہناز نبی، ترنم ریاض، فہمیدہ ریاض، کشور ناہید وغیرہ نے

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

بھی اپنے اپنے انداز میں تانیثیت اور تانیثی شعر و ادب کے بارے میں مضامین لکھے ہیں۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ مشتاق احمد وانی نے ایسی تمام معلومات کو یکجا کر کے پیش کر دیا ہے۔ اس اعتبار سے ان کی یہ تصنیف تحقیقی اعتبار سے تو اہم ہے لیکن اس میں تنقیدی مباحث اور نتائج کا فقدان ہے۔ بلکہ انہوں نے خواتین کے بارے میں ابتداء سے آخر تک بڑی معصومیت کے ساتھ جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ انسانی اور اخلاقی اعتبار سے قابلِ قدر ہیں۔لیکن اس طرح کے عام جذبات و تصورات کو نہ تو تحقیق کا نام دیا جا سکتا ہے نہ تنقید کا مثلاً۔اس کتاب کی تمہید کے درج ذیل اقتباس پر ایک نظر ڈالیں۔

''عورت' خالق کائنات کا ایک عظیم شاہکار ہے اس کی عظمت اور اہمیت سے بھلا کون انکار کر سکتا ہے۔اس کے کئی روپ ہیں وہ ماں جیسے مقدس رشتے کی علامت بھی ہے اور بیوی کی حیثیت سے اپنے شوہر کی بہترین ساتھی بھی بہن کی صورت میں اپنے بھائیوں کی ہمدرد اور غمگسار بھی اور بیٹی کی حیثیت سے اپنے والدین کی خدمات گزار بھی غرض یہ کہ عورت اپنے ہر روپ میں محبت بھرا دل رکھتی ہے ۔قدرت نے اسے حسن و جمال اور آرائش وزیبائش کا ایسا جذبہ عطا کیا ہے کہ وہ ہر چیز کو خوبصورت دیکھنا چاہتی ہے ۔دنیا کے تمام دانشوروں، عالموں اور عظیم ہستیوں نے عورت کی عظمت اور اُن کی اہمیت کا اعتراف کیا ہے۔تاریخ عالم کی سینکڑوں مثالیں عورت کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کے لئے کافی ہیں۔وہ نہ نفاست میں پیچھے ہے اور نہ ذہانت میں۔اُم المومنین حضرت عائشہؓ اسلام کی سب سے پہلی مفتی قرار دی گئیں ۔رحم دلی اور خدمتِ خلق میں مدر ٹریسا کو بھی

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ چاند بی بی اور جھانسی کی رانی کی بہادری
کے کارنامے تاریخ میں محفوظ ہی۔ اسی طرح کئی خواتین نے بہادری،
ذہانت اور ہنر مندی کے بہترین کارنامے انجام دیئے ہیں جنہیں
انسانی تاریخ ہرگز فراموش نہیں کرسکتی'' ۵؎

مشتاق احمد وانی کو یہ غلط فہمی ہے کہ تانیثی ادب سے مراد صرف اور محض عورتوں کا لکھا ہوا ادب ہے جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ واقعتاً ہر وہ تحریر جو ادب سمیت زندگی کے تمام شعبوں میں عورت اور مرد کی تفریق ختم کرنے پر اصرار کرے تانیثی تحریر ہے خواہ وہ تحریر کسی عورت نے لکھی ہو یا مرد نے۔ چنانچہ مشتاق احمد وانی نے اُردو کی قدیم و جدید خواتین شاعرات اور فکشن نگاروں کی شعری اور نثری تحریروں میں تانیثیت کے عناصر ڈھونڈ نے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس ضمن میں بھی انہوں نے نہ جانے کیوں ترنم ریاض، صادقہ نوابِ سحر، ذکیہ مشہدی اور لالی چودھری جیسی خواتین کی تحریروں پر زیادہ توجہ نہیں دی ہے جبکہ تانیثیت کو ان خواتین نے اپنی تحروں میں بڑے ہی دانشورانہ انداز میں تمام ترفنی و جمالیاتی خوبیوں کے ساتھ برتا ہے۔ البتہ اُردو ناول میں تانیثیت کی جستجو انہوں نے نذیر احمد، رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر، پریم چند، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور قاضی عبد الغفار کے ناولوں میں تو کی ہے لیکن پیغام آفاقی، مشرف عالم ذوقی اور غضنفر کے ناولوں کو زیرِ بحث لانے کی زحمت نہیں کی ہے جبکہ آفاقی کے ناول مکان، غضنفر کے ناول کینچلی اور مشرف عالم ذوقی کے ناول ''لے سانس بھی آہستہ'' وغیرہ میں تانیثیت کے عناصر وافر مقدار میں موجود ہیں لیکن ان کمیوں کے باوجود اُردو ادب میں تانیثیت ایک اہم تحقیقی و تنقیدی تصنیف ہے جس سے طلباء کو استفادہ کرنے میں بڑی مدد ملے گی۔ اس کتاب میں بھی جہاں مشتاق احمد وانی نے بعض نظموں اور غزلوں کے تجزیئے پیش کئے ہیں وہاں انہوں نے اپنی تنقیدی

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی پوری کوشش کی ہے پھر بھی یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مشتاق وانی جموں و کشمیر کے ایک ایسے محقق اور نقاد ہیں جن کے ذکر کے بغیر کشمیر میں اُردو تحقیق و تنقید کی موجودہ صورتِ حال کو سمجھا نہیں جا سکتا ہے۔

حواشی:

۱۔ مشتاق احمد وانی: ''مٹھا زہر'' ۲۰۰۸ء، ص ۸۔

۲۔ ضیاالدین، پروفیسر: اطراف تنقید، ناشر، سیمانت پرکاش، دہلی ۲۰۰۶ء، ص ۸۸۔

۳۔ پروفیسر عبدالرحمٰن ہاشمی: بحوالہ، مشتاق احمد وانی، تقسیم کے بعد اُردو ناول میں تہذیبی بحران، ناشر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۲۰۰۷ء، ص ۱۳۔

۴۔ مشتاق احمد وانی: تقسیم کے بعد اُردو ناول میں تہذیبی بحران، ناشر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہا ؤس، دہلی۔ ۲۰۰۷ء، ص ۱۳۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

عورت کا استحصال اور عصمت چغتائی

" لکھئے ضرور لکھئے۔ جو کچھ بھی آپ دیکھتے ہیں، ہنستے ہیں، سوچتے ہیں، وہ ضرور لکھئے۔ نہ زبان کی غلطیوں سے ڈریئے نہ اس بات سے ڈریئے کہ کوئی آپ کو ادیب نہیں مانتا۔۔۔۔ آئندہ نسل کے لئے لکھ جایئے"۔

بات سماجی حقوق نسواں کی برابری کی ہو یا ادب میں مساویانہ حقوقِ نسواں کی تو ہم مغرب کے مقابلے دور دور تک پیچھے رہے ہیں۔ ماضی کا ہندوستان رسوم ورواج کی جکڑ بندیوں میں تھا اور توہمات گلے کا ہار تھے۔ مرد کا معاشرہ تھا اور عورت حد درجہ مظلوم تھی۔ ہمارے ادب میں مرد اور عورت کے جو صنفی کردار متعین کئے گئے ہیں اُن کی تاریخ جانتے وقت ہمارا ذہن فوراً بنی آدم کی طرف مبذول ہوتا ہے۔ اُن کہانیوں کی طرف جو ہمیں بچپن میں اپنے والدین یا بزرگ سنایا کرتے تھے۔ ان کہانیوں میں جو نسوائی کردار پیش کئے گے ہیں ان کا اندازہ "عہد نامہ قدیم سے" ہی ہوتا ہے جس کے پہلے باب "تخلیق" میں آدم اور حوا کی کہانی کو بیان کیا گیا ہے، جس میں آدم شیطان کے بہکاوے میں نہیں آتا بلکہ حوا شیطان کے بہکاوے میں آکر ممنوعہ اناج کھالیتی ہے جس کے عوض میں آدم کو جنت سے بے دخل کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ کہانیاں جو بچپن میں ہم سنتے آئے ہیں جن میں

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

ایک ''چڑا اور چڑیا'' کی کہانی ہے جس میں چڑیا لاتی ہے دال کا دانہ اور چڑا لاتا ہے چاول کا دانہ، دونوں مل کر کھچڑی پکاتے ہیں۔ ایک روز چڑیا کے جھوٹ بولنے پر مادہ کردار چڑیا کو نر کردار چڑے نے کنویں میں ڈبو کر مار دیا تھا۔ دوسری پودنے اور پودنی کی کہانی ہے جس میں راجہ پودنی کو اُٹھا لے جاتا ہے اور پودنہ پودنی کی عصمت و عفت کا محافظ ہونے کے ناطے اپنی عزت کے لئے راجہ سے نہ صرف اکیلا معرکہ کرتا ہے بلکہ سارا سماج جن میں چیونٹیاں، دریا، آگ اور آندھی سب ہی شامل ہیں، ساتھ چل پڑے اور راجہ کے محل کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتے ہیں۔

بات اردو ادب کی جائے تو ''باغ و بہار'' سے لے کر آج تک ان دو صدیوں کے دوران ادب نے جو سماج کی عکاسی کی اس میں واضح طور پر مرد کی بالادستی نظر آتی ہے۔ مرد حاکم ہے، عورت محکوم ہے، زندگی میں فیصلے مرد کرتا ہے عورت ان فیصلوں کی تعمل لاتی ہے، عورت گھر کی چکی میں پستی ہے، مرد کی ہوس کا شکار بنتی ہے، ہر سال بچے جنتی، تعلیم کے جوہر سے محروم رہتی، اقتصادی طور پر مرد کی دستِ نگراں رہتی، مرد غیر عورتوں سے دل کی دُنیا آباد کرتا ہے، عورت اس ناانصافی پر اُف نہیں کرتی۔ عورت کے لئے ضروری تھا کہ مرد کے متقرر کردہ مقیاس پر پوری اُترے، یہ کرے اور یہ نہ کرے، یوں جیئے اور یوں نہ جیئے، کسی نے اُسے حسن کا پیکر گردانا، کسی نے اُسے پارسائی اور نیک سیرتی کا مجسمہ قرار دیا، کسی نے اُسے خدا کے بعد سب سے قابل احترام ہستی جانا تو کسی نے اُسے شیطان کی خالہ گردانا۔ اس روایتی جمود کو توڑنے کے لئے اگر عالمی تناظر میں دیکھا جائے تو چین میں کنگ یووی (vu king) مصر میں احمد فرید اور کاظم علی نے عورتوں کی آزادی کے لئے بیج بویا تھا۔ 1920ء میں دانیال دیفو نے اپنی کتاب ''تعلیم نسواں'' میں عورتوں کی تعلیم کی مخالفت کرنے والوں کی سخت مذمت کی اور اسے دنیا کا سب سے بدترین ظلم اور بربریت قرار دیا۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

ہندوستان میں راجہ رام موہن رائے ، ودیا ساگر، رام کرشنا، رابندر ناتھ ٹیگور، سر سید احمد خان، الطاف حسین حالی، گاندھی، سجاد حیدر یلدرم وغیرہ نے جو تحریکیں چلائیں چاہے وہ مذہبوں کے تحت ہوں یا ویسے ہی تو ان سب کا مقصد گھر کے دائرے میں عورتوں کی حیثیت کو بہتر بنانا تھا اور خاندان میں اس کو عزت و وقار بخشنا تھا۔ اس روایت کا انحراف ''داستان امیر حمزہ'' میں نظر آتا ہے جو 46 ہزار صفحات پر مشتمل ہے کہ کس طرح نسائی کردار مردانہ وار فیصلے کرتے ہیں، اپنی جرات سحر مندی سے مرد کو زیر کر کے گھوڑے کی پشت پر ڈال کر لے آئیں۔ لہذا یہ داستان برصغیر کے سماج کی رسوم و روایات کی کھلی بغاوت تھی۔ انیسویں صدی میں برطانوی تسلط، سر سید تحریک، مغربی تعلیم اور صنعتی دور نے اردو ادب پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے۔ نتیجتاً اردو ادب میں ایسے ادیب اُبھرے جنہوں نے تعلیم نسواں، حقوق نسواں اور پردے سے نجات کی بات کی۔ ایسے ناسازگار ماحول میں بے باکانہ تبلیغ کرنا اور دوسروں کو راہ راست پر لانا ایک مرد مجاہد کا کام تھا جو عصمت چغتائی نے کر دکھایا۔

برصغیر کی مشہور اردو مصنفہ عصمت چغتائی کی پیدائش اگست 1915 میں اتر پردیس میں ہوئی۔ بہن بھائیوں کی کثرت کے بارے میں خود لکھتی ہیں ''اتنے سارے بچے تھے کہ ہماری اماں کو ہماری صورت سے قے آتی تھی۔''[1] چنگیز خاندان سے تعلق تھا اس لئے ڈیل ڈول بڑا اچھا اور کم عمری میں ہی وہ بڑی دکھتی تھیں۔ جس کے عوض میں کم عمری میں ہی ایک ڈپٹی صاحب سے شادی طے ہو گئی تھی جس کو انہوں نے اپنے ماموں زاد بھائی کو خط لکھ کر ٹال دیا تھا۔ شادی کے حوالے سے یوں کہتی ہیں۔

> ''میں شادی نہیں کرنا چاہتی تھی، وہاں پڑوس کا ایک لڑکا پسند آ گیا تھا اُس وقت میں بارہ یا تیرہ سال کی تھی۔۔۔۔ وہ صاحب چھبس تا ستائس برس کے رہے ہوں گے۔ ہماری کوٹھی کے پاس ہی رہتے

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

تھے۔۔۔اس وقت میں پابندی سے اُنھیں دیکھا کرتی تھی۔انہوں
نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا ہوگا کہ یہ چھوٹی سی ننھی منی ان پر دل
و جان سے عاشق ہے۔۔۔تیس سال بعد بمبئی میں شاہد لطیف کی
ایک فلم کے سیٹ پر آئے مجھے پہچانتے ہی گلے لگالیا۔میں نے دل
میں سوچا ارے کم بخت اب کیا فائدہ ؟ تیس سال پہلے لگایا ہوتا اپنی
دنیا میں کیا نہ ہو گیا ہوتا۔۔۔۔کم بخت نے میرا بچپن ہی سکھا دیا۔۲

یہاں عصمت نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ بے میل شادی اور لڑکپن کی شادی کے خلاف ہیں اور اس سے ہونے والے نقصانات کا ذکر انہوں نے ''لحاف'' جیسی کہانی میں کیا ہے۔عصمت نے بچپن میں ہی اس راز کو جان لیا تھا کہ والدین لڑکیوں سے لڑکوں کے مقابل امتیازی سلوک کرتے ہیں اور لڑکے بھی لڑکیوں کو اپنے مقابل کمتر سمجھتے ہیں۔ان کی ابتدائی کہانیاں رومان سے بھرپور تھیں جن کو بعد میں انہوں نے نذرِ آتش کر دیا تھا جس کی وجہ خود انھیں کے الفاظ میں جانتے ہیں۔

''میں پاس میں غسل خانے میں نہا رہی تھی سر میں بیسن ڈال چکی تھی،
اف فو بیان نہیں کر سکتی کیا حالت ہوئی۔ یا خدا اگر اک سطر اور آگے
پڑھ لی تو پھر ڈوب مرنے کے سوا کہیں ٹھکانا نہ رہے گا۔ہیبت زدہ ہو
کر میں نے غسل خانے سے زور زور کی چیخیں ماریں کہ سارا گھر ہل
گیا۔لوگ سمجھے شاید موری سے سانپ نکل آیا اور مجھے ڈس لیا۔شمیم
بے چارہ کاغذ پھینک پھانک میری جان کی خیر منانے لگا۔میں نے
الٹے سیدھے کپڑے پہنے اور باہر نکل کر شمیم کا منہ نوچ
ڈالا۔۔۔آگے اسے پڑھنے کا ہوش ہی نہیں رہا۔وہ خود میری زندگی

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا میں نے اسی وقت سارا پلندہ جلا کر خاک کر دیا۔

شمیم نے بہت کہنے کی کوشش کی کہ میں نے نہایت گندی کہانیاں
لکھیں تھیں مگر میں نے جھٹلا کر کہا ٹرانسلیشن تھا۔'' [۲]

عصمت نے کالج کی تعلیم کے دوران برنارڈ شاہ کی کہانیوں کو پڑھنا شروع کیا تو ہاسٹل میں عصمت کا نام ہی برنارڈ شاہ رکھ دیا گیا۔ دورانِ کالج انہوں نے کہانی ''فسادی'' لکھی جو ساقی میں شائع ہوئی۔ عصمت کو کتابیں پڑھنے، رسائل واخبارات پڑھنے میں بچپن سے ہی شوق تھا۔ ان کے کمرے کا منظر پدما سچدیو نے یوں بیان کیا ہے۔

''عصمت کے پلنگ پر ان کے جانے پہچانے پاندان کے علاوہ دیس
بدیس سے آئے اخبارات، رسائل، کتابیں اُن کی ادھوری کہانیوں
کے اوراق، چھالیہ اور قوام والی تھالیاں، سگرٹ لائٹر، حنا کی شیشی،
آئے ہوئے خطوط اور تاش کی گڈی پڑی رہتی تھی۔'' [۳]

علی گڑھ میں دوران تعلیم شاہد لطیف سے دوستی ہوئی جو بعد میں شادی میں تبدیل ہو گئی لیکن شادی سے دو ماہ قبل ان کی کہانی ''لحاف'' شائع ہوئی تھی جس نے ایک ہل چل مچا دی اور شادی ٹوٹتی ٹوٹتی بچی تھی۔ خود کہتی ہیں۔

''لحاف نے مجھے بڑے جوتے کھلوائے۔ اس کہانی پر میری اور شاہد
کی اتنی لڑائیاں ہوئیں کہ زندگی جنگ کا میدان بن گئی۔'' [۴]

مقدمہ خاندان میں ہی نہیں مقدمہ عدالت میں بھی صادر ہو گیا جس کی وجہ سے عصمت کافی بدنام ہوئیں۔ اسلم صاحب سے لحاف کے حوالے سے بحث کرتے ہوئے کہتی ہیں۔

''اصل میں اسلم صاحب مجھے کبھی کسی نے نہیں بتایا کہ ''لحاف'' والے

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

موضوع پر لکھنا گناہ ہے۔ نہ میں نے کسی کتاب میں پڑھا کہ اس
مرض کے بارے میں نہیں لکھنا چاہئے۔ شاید میرا دماغ عبدالرحمٰن
چغتائی کا برش نہیں ایک سستا سا کیمرہ ہے جو کچھ دیکھتا ہے کھٹ سے
بٹن دب جاتا ہے اور میرا قلم میرے ہاتھ میں بے بس ہوتا ہے۔"[5]

عدالت میں کافی بحث ومباحثے کے بعد جج صاحب نے "لحاف" میں فحاشی نہ ہونے کا اعتراف یوں کیا۔

"جج صاحب نے مجھے کورٹ کے پیچھے ایک کمرے میں طلب کیا اور
بڑے تپاک سے بولے' میں نے آپ کی اکثر کہانیاں پڑھی ہیں اور
وہ فحش نہیں، اور نہ "لحاف" فحش ہے۔"[6]

کہانی "کافر"، "فسادی"، "بچپن"، "خدمت گار" اور خاص کر "لحاف" کے بعد عصمت کے اندر ایک ایسا باغیانہ جوش پیدا ہوا کہ جب انہوں نے اس گھٹن زدہ ماحول کی لاچار عورت کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا تو اردو ادب کے دیگر افسانہ نگاروں کو عصمت کا یہ باغیانہ لہجہ حیران کر گیا۔

عصمت چغتائی کی شاہکار تخلیقات میں "کلیاں" (1940)، "چوٹیں" (1942)، "ایک بات" (1952)، "چھوئی موئی" (1952)، "دو ہاتھ" (1962)، "زہر"، "پہلی لڑکی"، "خرید لو"، "بدن کی خوشبو"، "آدھی عورت"، "آدھا خواب"، "ٹیڑھی لکیر"، "ضدی"، "معصومہ"، "دل کی دنیا"، "سودائی"، "انسان اور فرشتے"، "شیطان"، "چوتھی کا جوڑا" وغیرہ اہم ہیں۔ ان تخیقات میں انہوں نے نہ صرف عورتوں کے مسائل یا نفسیات کو بلکہ صنف مقابل کی نفسیات وتحلیل کو بھی ویسی ہی قدرت سے پیش کیا۔ انہوں نے نہ صرف نچلے طبقے پر اپنی نگاہ رکھی بلکہ اعلیٰ طبقوں کی بھی ترجمانی کی ہے۔ متوسط طبقے

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

کے نوجوانوں کی جنسی گھٹن، اعلیٰ طبقے کی بداعمالی اور ریاکاری، عورت کے استحصال اور جنسی لعنتوں پر انہوں نے گہری نظر رکھی بقول صلاح الدین

''اس نے محل اور جھونپڑی دونوں کے تاریک گوشوں کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ دیکھا ہے'' 7

عصمت چغتائی نے اپنی ان تخلیقات کے ذریعے مخالف حضرات کے جگروں میں اس قدر نشتر لگائے کہ وہ اپنے زخموں کی گہرائی کا اندازہ کرنے میں محو رہے اور عصمت اپنا کام کر گئیں۔ عصمت چغتائی نے خود پر لگائے گئے الزامات اور بہتان تراشی کی کبھی پرواہ نہیں کی ملاحظہ کریں۔

"دُنے دینے سے کچھ نہیں ہوتا، بڑھیاں طعنے دیتی مر گئیں۔۔۔ بوڑھے لاحول بھیجتے چل دیئے۔'' 8

''آپ کے اعتراض اور طعنے خاموش دبک جانے پر مجبور نہیں کر سکتے وہ چیختے گا۔۔۔۔ دکھ ہوگا تو روئے گا۔۔۔۔ جب بھوک ہی ٹھری تو پھر ہائے ہائے کیوں نہ ہو۔'' 9

عصمت جس طرح خود باغی، اکھڑ، ضدی، نٹ کھٹ ہے اسی طرح عصمت کی کہانیوں میں کردار بھی۔ ان کہانیوں میں عورت اپنے حق سے انجان کبھی نہیں رہتی، وہ ہر حال میں اپنا حق چاہتی ہے جس کے لئے وہ خون سے لت پت زندگی جیتی ہے اور اپنی جان کی پرواہ نہیں کرتی۔ ان کے چند نسوانی کردار اپنی جرأت مجاہدہ کی وجہ سے تمام ناولوں اور افسانوں میں ایک مثال بن گئے ہیں۔ ان میں ضدی کی ''سانتا''، معصومہ کی ''بیگم صاحبہ''، ٹیڑھی لکیر کی ''شمن''، دل کی دنیا کی ''قدسیہ خالہ''، سودائی کی ''چاندنی''، جنگلی کبوتر کی ''عابدہ''، باندی کی ''گوری بیوی'' اور حرمہ و خفیرہ وغیرہ ایسے کردار ہیں جنہوں نے

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

اپنے راستے کا انتخاب خود کیا اور اس پر چل کر کامیاب بھی ہوئے۔ ان کہانیوں میں عصمت کسی نہ کسی روپ میں ضرور نظر آتی ہیں چاہے وہ معصومہ کی بیگم صاحبہ ہوں، سودائی کی چاندنی ہوں، گوری بیوی یا ٹیڑھی لکیر کی شمن یا پھر دل کی دنیا کی قدسیہ خالہ ہوں۔ ٹیڑھی لکیر کے حوالے سے یوں کہتی ہیں۔

"اس ناول کو کچھ لوگوں نے میری آپ بیتی کہا ہے۔ مجھے خود یہ آپ بیتی لگتی ہے۔۔۔۔۔ میں نے شمن کے دل میں اترنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے ساتھ آنسوں بہائے ہیں اور قہقہے لگائے ہیں۔ اس کی کمزوریوں سے جل بھی اُٹھی ہوں، اس کی ہمت کی داد بھی دی ہے۔" [۱۰]

عصمت چغتائی کی تحریروں میں بے پناہ شوخی، تلخ و شریں ملی جلی کیفیت، نوکیلے جُملے، رونے رولانے، ہنسنے ہنسانے کے دل آویز انداز کا ذکر ہے۔ آپ شوخی طبع اور چلبلے پن کی مالک تھیں، بے تکلفانہ انداز حد سے زیادہ تھا۔ چند مثالیں پیش ہیں۔ 1981ء میں شمس کنول نے عصمت کو لکھا کہ وہ ان سے صرف پندرہ منٹ کے لئے کسی ضروری کام سے ملنا چاہتے ہیں اور فلاں دن بوقت شام اُن کے ہاں آئیں گے۔ تو عصمت کی طرف سے جواب ملاحظہ کریں۔

"عزیزم تم غیر ضروری کام سے بھی مجھ سے مل سکتے ہو، کیا میرا کار آمد ہونا ضروری ہے۔ تم معہ صاحب خانہ کے آؤ۔ پندرہ منٹ کے لئے نہیں پندرہ گھنٹے کے لئے تو کم از کم آؤ! تمہاری عصمت۔" [۱۱]

ایک مجلس میں قرینے اور نوحے پڑھے جا رہے تھے اور ایک جگہ ذکر آیا کہ علی اصغر کے حلق میں تیر پیوست کر دیا تو عصمت بے تحاشہ چلا پڑیں اور بے تحاشہ ڈھارنا شروع کر

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

دیا، ''کیوں مارا، حلق میں تیر کیوں مارا'' زور زور سے روتی چلاتی عصمت کو چپ کرانے سے سب قاصر رہے تو عصمت کو نکال مجلس سے باہر کیا۔ لیکن عصمت تو گھر پہنچ کر بھی اُسی آہنگ اور انداز میں چلا چلا کر پوچھتی رہیں

''تیر کیوں مارا، ہاتھ میں مار دیا ہوتا، بیچارے کے حلق میں تیر کیوں مارا۔'' ۱۲

راجندر سنگھ بیدی بیمار ہوئے تو عصمت اور دیگر دوست واحباب شب وروز مزاج پُرسی کے لئے جایا کرتے تھے۔ چند دنوں بعد دوستوں نے کنارہ کشی کرلی اور عصمت اکیلی گئیں اور اُنھیں معلوم ہوا کہ بیدی اُس چارپائی سے گر پڑے تھے۔ بیدی نے عصمت کو دیکھتے ہی بے ساختگی میں کہا کہ ''اب مر ہی جاؤں تو اچھا ہے''۔ جواب میں عصمت کہنے لگیں ''ارے جی کرہی تم نے کیا کرلیا جو مر کر کرلو گے، پڑے رہوں جہاں ہو'' ۱۳ تو انتہائی درد میں بھی بیدی مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

عصمت چغتائی کے لہجے میں ایک ایسی معدومیت، اپنائیت اور اُنسیت تھی کہ کتنی بھی رنجش کیوں نہ ہوتی عصمت اُسے محبت میں بدل دیتی تھیں مثال پیش ہے۔ قراۃ العین حیدر اور عصمت چغتائی کے درمیان تعلقات کشیدہ تھے۔ ایک دن مشہور ادیبہ اجیت کور کے ہاں دعوتی تقریب میں قراۃ العین حیدر تشریف فرماں تھیں اور عصمت چغتائی بھی موجود تھیں تو عصمت اُن کے پاس جا کر بولیں ''چڑیل میرے ساتھ بات کرنی ہے یا نہیں؟۔'' ۱۴ تو لفظ ''چڑیل'' میں اس قدر اپنائیت تھی کہ قرۃ العین کی رنجش مٹ گئی۔

عصمت چغتائی کی تحریروں کو اہلِ زمانہ نے عریانیت سے منسوب کر دیا تھا جب کہ ان کی کہانیوں کو پڑھنے کے بعد لگتا ہے کہ انہوں نے حقیقت کو بیان کیا ہے۔ روایتی ادب سے ہٹ کر ایک نیا ادب تخلیق کیا جو زمانے والوں کو پسند نہ تھا۔ انہوں نے نقائص

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

زمانہ کی ہو بہو مصوری کی اور اہل زمانہ کو ایک ایسا آئینہ دیکھایا جو غلازت اور آلودگی کو واضح طور پر دیکھا رہا تھا۔ جس کے سبب اہلِ زمانہ عصمت کی تحریروں سے خائف تھے۔ اس حوالے سے عصمت یوں کہتی ہیں۔

''پرانا ادب بھی زندگی کی تصویر تھی اور نیا ادب بھی۔ یہ مانا کہ جب پرانا ادب لکھا گیا تو یہ دنیا اتنی گندی اور عریاں نہیں تھی اور اب آپ جدھر نظر اُٹھا کر دیکھئے دُنیا ننگی، بھوکی، چور، اور مکار نظر آتی ہے۔ نئے ادیب کیا کریں۔ کیسے آنکھوں پر پٹی باندھ کر گل بکاولی اور مثنوی گلزار نسیم لکھیں۔'' ۱۵؎

''اگر نیا ادب گندہ ہے تو اس کا مطلب یہ کہ نئی دُنیا گندی ہے، جس کی یہ تصویر ہے، مصور کا کیا قصور؟'' ۱۶؎

اس شدید سے شدید مخالفت اور مزاحمت کے باوجود بھی عصمت نے شکشت نہیں کھائی۔ ایک مجاہدہ ادیب کی حیثیت سے کام کرتی رہیں، مخالف طبقے کو یہ یقین دلانے میں مکمل طور پر کامیاب رہیں کہ عورت جو انسان کی معلّمہ اول، جس کے بغیر معاشرے کی تشکیل اور انسانی وجود کی نشو ونما ناممکن، جس کے بغیر زندگی کی تکمیل کا تصور ناممکن، جس کے وجود سے پیغمبر، مصلح اور عہد ساز شخصیتیں پیدا ہوئیں، جس کی پاکیزگی کی وکالت مذہبی کتابوں اور عظیم دانشوروں نے بھی کی۔ عصمت کی عورت اب انصاف چاہتی ہے، شانہ بہ شانہ چلنا چاہتی ہے۔ آخر میں عصمت کے چند اقتباسات کے ساتھ اجازت چاہوں گا۔

''جو نظام لڑکوں کو پسند نہیں وہ لڑکیوں کو کب تک پسند آ سکتا ہے، مرد اگر چیخ سکتا ہے تو عورت کو بھی کراہنے کی اجازت ہونی چاہئے۔'' ۱۷؎

''نئے ادب جس کو عریانیت سے منسوب کیا جاتا ہے لیکن اس نئے

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

ادب کے پڑھنے سے جنسی اور رومانی مسائل نہ ہونگے، بدمعاشی نہ ہوگی، طوائفوں کے اڈے نہ ہونگے اگر ہو نگے تو صرف انسانوں کے گھر ہونگے جہاں انسان رہے گا۔۔عورتوں کو بھوکی کتیوں کی طرح غلیظ موریوں میں عذاب دوزخ بن. روتا۔عورت کی عزت لٹ سکتی ہے، مرد کی نہیں لٹتی۔شاید مرد کی عزت ہوتی نہیں جو لوٹی کھسوٹی جا سکے۔عورت کے حرامی بچہ ہوتا ہے، مرد کا کچھ نہیں ہوتا۔'' 9

حواشی۔۔

1۔ عصمت چغتائی: غبارِ کارواں، مضمون، (آجکل) نئی دہلی 1970 ص 2

2۔ عصمت چغتائی: کاغذی ہے پیرہن، ص 17، 54، 45، 54، 7

3۔ عصمت چغتائی: ایک بات، ص 10، ص 8

4۔ عصمت چغتائی۔: ٹیڑھی لکیر: ص 4

5۔ شمس کنول: عصمت سماج کی محتسب، "مضمون" ماہنامہ آجکل، نئی دہلی جنوری 1996ء

6۔ عصمت چغتائی: غبار کارواں، مضمون، ماہنامہ آجکل، نئی دہلی، نومبر 1970، ص 7

7۔ پدما سچدیو: ذکر اُس پروش کا، سہ ماہی، سم کالین بھارتیہ ساہتیہ، (ہندی)، نئی دہلی اپریل جون 1995 ص 102

8۔ عصمت چغتائی: ایک بات، ص 8، ص 8، ص 9

امدادی کتب۔

1۔ رخسانہ جمیل: اردو کی اہم خواتین افسانہ نگار، ایم۔آر پبلیکیشنز۔

2۔ ترنم ریاض: بیسویں صدی میں خواتین کا اردو ادب، مطبوعہ 2004ء

3۔ نکہت آرا شاہین: عصمت چغتائی کے ناولوں میں عورتوں کے مسائل، حیدرآباد 1995ء

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

خواجہ میر دردؔ کی شاعری میں تصوفانہ افکار

شعروادب کوکسی بھی معاشرے میں ایک ایسی کسوٹی کی حیثیت حاصل ہے جس سے کسی قوم اور خطے کے تشخص کو جاننے، پہچاننے اور اُبھارنے میں مدد ملتی ہے۔ جب ہم اپنے آباء سے ملنے والے شعری اور ادبی ورثے کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ ہمارے آباء نے شعری وادبی روایت کا کیا معیار بنایا

ہے اور یہی شعری وادبی روایت ہی اس عہد کی سوچ کو عیاں کرتی ہے، یہی اُس عہد کی عملی زندگی کا حصہ بھی تھی۔ اس سوچ سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ اِن ہستیوں کو نہ صرف اپنی سوچ سے محبت تھی بلکہ انھیں اپنی زبان وثقافت اور اپنی زمین کے ساتھ ساتھ اپنے مذہب سے بھی بے انتہا محبت تھی۔ ادب میں شاعری ہو یا نثر ہر موضوع چاہے حسن وعشق کا ہو، ہجرو فراق ہو یا فلسفیانہ، اس کی نادر مثالیں ہمارے ادب میں موجود ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ تصوف جیسے خشک موضوع کو ہمارے شعراء نے بہت سادگی اور سلاست سے بیان کیا ہے۔ ادب اور شاعری کے لئے تصوف کوئی نئی چیز نہیں ہے تصوف کی تبلیغ وترجمانی کا ذریعہ ادب وزبان ہی رہا ہے۔

اگرچہ تصوف Mysticism قریب قریب دنیا کی ہر قوم میں موجود ہے اور آج

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

سے نہیں، تاریخ کے اولین اوراق سے اس کا تذکرہ شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود مذہب Religion کی طرح اس کی بھی کوئی جامع اور مانع تعریف Precise Definition آج تک نہیں ہو سکی، اس کا دائرہ بہت سے داخلی تجارب و کیفیات، احوال و مقامات اور شعائر و مناسک کو محیط ہے۔ لیکن ان میں دو بنیادی عناصر ایسے ہیں جو تصوف کی اصل سمجھے جاتے ہیں یعنی (۱) انسان کا خدا کے ساتھ براہ راست مکالمہ اور (۲) نفسِ انسان کا حقیقت مطلقہ (یعنی خدا) کے ساتھ مل جانا، جسے وصال یا فنا کہتے ہیں۔ یہ کیفیات ہر فرد کی ذاتی (یعنی انفرادی) ہوتی ہیں جس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہوتا، نہ وہ فرد ان کیفیات کو کسی دوسرے کو محسوس کرا سکتا، نہ ہی بتا اور سمجھا سکتا ہے۔ اس اعتبار سے تصوف، بحیثیت ایک مذہب کے، یکسر شخصی یا ذاتی Personal Religion ہوتا ہے۔ بہر حال میرے روئے سخن کا موضوع ہے ''خواجہ میر دردؔ کی شاعری میں تصوفانہ افکار'' تو اس سے قبل مناسب ہے کہ تصوف کے ماخذ اور تصوف کے معنی کو مکمل طور سے سمجھ لیا جائے تا کہ موضوع کے پورے حق کی ادائیگی میں آسانی ہو۔

ا۔ تصوف کا ماخذ و آغاز:

صوفی اور تصوف کے بارے میں اور اس کے مادہ استقاق کے متعلق بہت سی اختلافی آراء پائی جاتی ہیں اس حوالے سے ہر صاحب علم اور مفکر نے اپنی سمجھ کے اعتبار سے رائے دی ہے۔

ا۔ حضرت علی ہجویری (م۱۰۷۲ھ) فرماتے ہیں:

''بعض لوگوں کا خیال ہے کہ صوفی صفا سے مشتق ہے۔۔۔ چونکہ اہلِ تصوف اپنے اخلاق اور معاملات کو صاف رکھتے ہیں اور قلب آفات سے بری ہوتے ہیں اس لئے صوفی کہلاتے ہیں۔ اس فرقہ

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

کے لیئیہ لفظ اسم علم کی حیثیت رکھتا ہے۔۔۔''[1]

۲۔حضرت جنید بغدادی (۲۱۵ھ۲۹۸ھ) کا بیان ہے:

''تصوف کا ماخذ ''اصطفا'' ہے اس لئے برگزیدہ ہستی کو صوفی کہا جاتا ہے۔''[2]

۳۔علامہ ابن جوزی (م ۵۹۷ھ) کا خیال ہے:

''صوفی ''صوفۃ'' سے بنا ہے صوفہ کے نام سے ایک قبیلہ تھا جو ایام جاہلیت میں خانہ کعبہ کی خدمت کرتا تھا اور حج کے زمانے میں حجاج کی رہبری کرتا تھا۔''[3]

۴۔علامہ لطفی جمعہ اپنی کتاب ''تاریخ فلاسفۃ الاسلام'' میں لکھتے ہیں:

''صوفی کا لفظ تھیوصوفیا (Theosophia) سے مشتق ہے جو ایک ہونانی کلمہ ہے اور جس کے معنی ''حکمت الٰہی'' کے ہیں۔''صوفی'' وہ حکیم ہے۔ جو حکمت الٰہی کا طالب ہوتا ہے اور اس کے حصول میں کوشاں۔۔۔''[4]

ایک اور قول کے مطابق لفظ صوفی ''صوف'' سے نکلا ہے۔عربی زبان میں'' صوف'' اونی لباس کو کہتے ہیں اور وہ لوگ جو تصوف سے لگاوٗ رکھتے تھے وہ صوف کا لباس پہنتے تھے تا کہ خود کو دُنیاوی عیش و آرام سے الگ رکھ سکیں اس حوالے سے صوف پہننے والے کو صوفی کہا جانے لگا۔ ابونصر سراج (م ۳۷۸ھ) نے اسی خیال کی تائید کی ہے:

''صوفیا کسی خاص علم کے ساتھ تعلق نہیں رکھتے اور نہ ہی احوال و مقامات میں کسی خاص حال یا مقام کے ساتھ مخصوص ہیں۔۔۔اس لئے انہیں ظاہری لباس سے منسوب کیا گیا کیونکہ ''پشمینہ'' (صوف)

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

پہننا انبیاء کی عادت اور اولیاء و اصفیا کا شعار تھا۔۔۔ اللہ تعالیٰ نے
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خاص اصحاب کا ذکر کیا ہے تو انہیں اُن
کے ظاہری لباس (سفید لباس) کی طرف منسوب کیا۔۔۔ میرے
نزدیک صوفیا کا بھی یہی معاملہ ہے۔۔۔ کہ انہیں بھی ان کے ظاہری
لباس کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔'' ۵

عمر بن محمد شہاب الدین سہروری مصنف ''عوارف المعارف'' بھی اپنی کتاب میں اس بات سے متفق ہیں اور اس رائے کو مستند مانا کہ ''صوفی'' کا مادہ ''صوف'' ہے اور بتایا کہ اونی لباس کو زیب تن کرنا رسول پاکؐ اور انبیاء کرام کی سنت ہے، اپنی کتاب حضرت انس بن مالک سے روایت لکھی ہے:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غلام کی دعوت قبول فرماتے، گدھے کی
سواری کرتے تھے اور اُون پہنتے تھے۔۔۔'' ۶

انھوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے ایک اور حدیث روایت کی ہے:

''رسول پاکؐ نے فرمایا جب حضرت موسیٰ نے اللہ سے کلام کیا تھا
اس وقت سرتاپا اُونی لباس پہنے ہوئے تھے، اُن کا جُبہ، پاجامہ، چادر
اور آستین سب اُون کی تھیں۔۔۔'' ۷

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی (م ۵۶۱ھ) نے بھی اس رائے کو درست قرار دیا ہے کہ صوفی اور تصوف کا لفظ ''صوف'' سے مشتق ہے اس کے علاوہ حضرت علی ہجویری داتا گنج بخش (م ۱۰۷۶ء) روایت بیان کرتے ہیں:

''رسول پاکؐ نے فرمایا ''لباسوں میں تمہارے لئے صوف'' ہے
تا کہ اپنے دلوں میں ایمان کی حلاوت محسوس کرو۔۔۔'' ۸

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

ان احادیث اور اقوال سے یہ سامنے آتا ہے کہ صوفی اور تصوف کا مادہ اور ماخذ ''صوف'' ہے، قواعد کی رو سے صوف کا اسم نسبت صوفی بنتا ہے۔ اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس لفظ میں اور بھی ایسے کئی استقاقات کی روح موجود ہے جو کسی بھی اعتبار سے قواعد کے مطابق درست نہیں بنتے۔ صوفی، حقیقت میں ظاہر و باطن کی پاکیزگی، صفائی اور حضورِ قلب کے حوالے سے سرفہرست ہونے کے ساتھ ساتھ علم و حکمت کے ان گنت خزانوں پر متصرف بھی ہوتے ہیں ان خزانوں سے مالا مال ہونے کے باوجود صوف کا لباس اُن کا شیوہ ہے۔

تصوف کیا ہے:

جس طرح اہلِ علم اور مفکرین صوفی اور تصوف کے مادہ اشتقاق پر اپنی الگ رائے رکھتے تھے اُسی طرح صوفی اور تصوف کی اصطلاح اور اس کے اصطلاحی مفہوم کے حوالے سے بھی صوفیا کرام میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

۱۔ حضرت جنید بغدادی کے مطابق:

''یہی تصوف ہے کہ تیرے اور میرے رب کے درمیان کوئی پردہ حائل نہ رہے۔''[۹]

۲۔ جناب رویم بن احمد نے ماہیتِ تصوف پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:

''اپنے نفس کو اللہ کی مرضی کے مطابق رکھنا ہی تصوف ہے۔''[۱۰]

۳۔ سمنون تصوف کا مفہوم بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''تو کسی دینوی چیز کا مالک بنے اور نہ کوئی شئے تیری مالک بنے یہی تصوف ہے۔۔۔''[۱۱]

۴۔ ابو محمد جریری نے تصوف کے متعلق یوں لکھا ہے۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

''ہر بری اور خسیس عادت کو چھوڑ کر پاکیزہ عادات اپنا لینا تصوف ہے۔'' ۱۲؎

۵۔عمرو بن عثمان مکی کے نزدیک تصوف عمل صالح کو اپنانے کا نام ہے:

''تصوف یہ ہے کہ بندہ ہر وقت عملِ صالح اختیار کرنے کا خواہاں رہے۔'' ۱۳؎

۶۔علی بن عبدالرحیم مناد تصوف کو یوں بیان کرتے ہیں:

''اپنے مقام و مرتبہ کو محبت الٰہی کے جذبے میں گم کر کے فنا سے کنارہ کشا ہو کر دوام سے واصل ہونا حقیقت تصوف ہے۔۔۔'' ۱۴؎

۷۔حسین بن منصور حلاج کے مطابق:

''صوفی اپنی ذات میں اس لئے واحد ہوتا ہے کہ نہ تو وہ کسی کو جانتا ہے اور نہ اس سے کوئی واقف ہوتا ہے۔'' ۱۵؎

۸۔عبدلواحد بن زید کے مطابق:

''صوفیا وہ ہیں جو اپنی عقلوں اور قلوب کو مصائب و آرام کے باوجود ثابت قدم رہتے ہیں اور نفس کے ہر شعلہ شرانگیز کو مرشدِ کامل کی اتباع سے سرد کر دیتے ہیں۔'' ۱۶؎

ان تعریفات کی روشنی میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ تصوف دراصل صوفیا کا طریقہ ہے اس طریقے پر چل کر وہ تزکیہ نفس کی حدود سے پاکیزگیٔ قلوب کا اہتمام کرتے تھے۔ ان تمام طریقوں کو شرح محمدی کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنایا جاتا ہے۔ ان طریقوں سے صوفی منزل معرفت الٰہی کو پہنچتا ہے۔ معرفتِ الٰہی کی منزل کو پانے والے صوفی یا ولی کہلاتے ہیں۔ ان طریقوں پر عمل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ بندہ فضائل

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

اخلاق کو اپنا کر رذائلِ اخلاق کو ترک کر دے۔ اس کے بعد اُسے خالق و مالک کی معرفت عطا ہوتی ہے۔ ان تمام تقریبات کی موجودگی میں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے جب تصوف کی بنیاد اور مقصد قرب الٰہی کو شروع محمدی کے ذریعے ہی سے پانا ہے تو پھر صوفیاء کرام نے اس کی تعریف ایک دوسرے سے مختلف کیوں کی ہے۔؟ تصوف کی بنیاد دراصل ذاتی احساس، تجربے اور ذاتی تجربے پر ہے۔ صوفیا نے اپنے اپنے وجدان اور تجربے و ذوق سے جو محسوس کیا اُسے اپنے انداز میں بیان کر دیا۔ اس کے باوجود بھی سب نے بیان ایک ہی بات کی ہے مگر ان سب کے انداز اور طریقے ایک دوسرے سے جدا جدا ہیں۔ سب صوفیاء کا مقصد اگرچہ قرب الٰہی اور معرفتِ الٰہی کا حصول ہی ہے مگر سب نے اپنے اپنے الگ الگ راستے اور طریقے اپنائے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان صوفیاء کی تعریفات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

خواجہ میر درد کی شخصیت اور حالات:

خواجہ میر دردؔ کا دور ہندوستان کی تاریخ کا بصیرتی اور بے قراری کا دور تھا۔ مصیبتیں ہندوستان پر نیا نیا روپ دھار کر نازل ہو رہی تھیں۔ خواجہ میر دردؔ کی ہستی کا شمار اُن صاحب علم لوگوں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنے عہد کی معاشرت پر گہرے اثرات مرتب کئے ہیں۔ خواجہ میر دردؔ ایک صوفی شاعر ہی نہیں بلکہ ایک عالم باعمل بزرگ، ایک پہنچے ہوئے درویش ہونے کے ساتھ ساتھ تصوف کے فلسفی اور دین کے ماہر بھی تھے۔ اپنے سلسلہ ارادت کے اعتبار سے اور نسب کے اعتبار سے خواجہ میر دردؔ نجیب الطرفین سید تھے۔ دردؔ کا سلسلۂ نسب والد کی جانب سے حضرت بہاء الدین نقشبند سے جبکہ والدہ کی طرف سے آپ کا سلسلۂ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی سے جا ملتا ہے۔

رام بابو سکسینہ اپنی کتاب ''تاریخ ادب اردو'' میں لکھتے ہیں:

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

''سلسلہ نسب خواجہ بہاؤ الدین نقشبند سے ملتا ہے اور ماں کی طرف سے حضرت غوث الاعظم رحمتہ اللہ علیہ تک پہنچتا ہے۔'' ۱۷

وزیر آغا لکھتے ہیں:

''شیخ عبدالقادر گیلانی (۱۰۷۷ء تا ۱۱۶۶ء) نے ایران میں قادریہ سلسلے کی بنیاد رکھی اور مخدوم شیخ محمد نے اسے ہندوستان میں فروغ دیا۔ نقش بندی سلسلے کے بانی خواجہ بہاؤ الدین نقشبندی (۱۳۸۸) تھے۔'' ۱۸

خواجہ میر درد کے آباء عہد عالمگیر میں بخارہ سے ہجرت کر کے ہندوستان میں وارد ہوئے، آپ کے والد خواجہ محمد ناصر عندلیب ۱۱۰۵ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے دو شادیاں کی تھیں۔ خواجہ میر درد دوسری شادی سے تھے۔ درد اپنی تصنیف ''علم الکتاب'' کے صفحہ ۸۴ پر لکھتے ہیں۔

''اسم ایں فقیر کہ خواجہ میر است وقت تولد بندہ والدِ بزرگوارِ والدۂ ماجدہ ام سید العارفین حضرت میر سید محمد حسینی قادری بن نواب میر احمد خاں شہید قدس سرہ ما العزیز گذشتہ اند۔۔۔'' ۱۹

ڈاکٹر عبادت بریلوی نے خلیل الرحمان داؤدی کی تحقیق کی بنیاد پر خواجہ میر درد کی تاریخ پیدائش ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

''خواجہ میر درد ۱۹ ذیقعدہ ۱۱۳۳ھ کو دلی میں پیدا ہوئے۔'' ۲۰

رام بابو سکسینہ سن ولادت ''۱۱۳۳ھ بمطابق ۱۷۲۱ء'' بتاتے ہیں۔ ۲۱

ڈاکٹر جمیل جالبی تحریر کرتے ہیں کہ:

''میر درد کی پیدائش کے وقت دلی بظاہر آباد لیکن اجڑنے کے لئے

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

تیار تھی، فتنہ وفساد ہر طرف سر اٹھا رہے تھے۔ مغلیہ سلطنت کا عروج
وقت غروب کو پہنچ چکا تھا۔ محمد شاہ کی بادشاہی کا سال دوسرا تھا۔"۲۲

اردو ادب کے تمام تذکرہ نگار اس بات سے متفق ہیں کہ خواجہ میر دردؔ نے تمام علوم شرعیہ ورسمیہ اپنے والد ماجد سے ہی پڑھے تھے۔ فارسی زبان وادب کے حصول کے لئے خواجہ میر دردؔ کا سراج الدین علی آرزو اکبر آبادی کے سامنے زانوئے تلمذتہ کرنے کا بنیادی سبب یہ بھی ہے کہ علوم تصوف کے تمام رموز فارسی زبان میں تھے۔ تصوف کے بنیادی نکات کو جاننے کے لئے فارسی زبان پر دسترس رکھنا اُن کے لئے ضروری تھا اس لئے انھوں نے سراج الدین علی آرزو اکبر آبادی کی رہنمائی کے لئے ہاتھ پھیلائے اور علمی استفادہ کیا۔ خواجہ میر دردؔ کی تعلیم وتربیت کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی خواجہ میر دردؔ کی تصنیف "دردِدل" کا حوالہ دیتے ہوئے بیان کرتے ہیں:

> "جناب اقدس کے ایما کے مطابق وسط جوانی میں عقائد، معمولات اور اصول تصوف وغیرہ کے علوم رسمیہ بقدرِ ضرور حاصل کئے تھے۔"۲۳

خواجہ میر دردؔ نے تحریر وتصنیف کا کام پندرہ سال کی عمر میں شروع کیا۔ آپ نے پندرہ سال کی عمر میں بحالت اعتکاف رسالہ "اسرار الصلوٰۃ" ۱۷۴۵ء میں تحریر کیا۔ رسالہ "واردات" ۱۷۵۸ء میں تحریر کیا جو ایک سو گیارہ واردات پر مشتمل ہے۔ اور تصوف پر مبنی ایک ضخیم تصنیف "علم الکتاب" تحریر کی جس کا اصل ماخذ "نالہ عندلیب" ہے۔ دردؔ نے اس تصنیف کو علم الٰہی کا صحیفہ قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ رسالہ "دردِدل"، "نالہ درد"، "آہ سرد"، "شمع محفل"، "حرمت غنا"، "دیوان فارسی اور دیوان اردو تصانیف کئے۔ آپ کی وجہ شہرت اردو دیوان بنا۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

واردات اور علم الکتاب دونوں میں اس بات کا التزام رکھا گیا ہے کہ ہر موضوع کے آغاز میں قرآنی آیات واحادیث نبوی سے استنباط کیا جائے اور ان ہی کی شرح و تفصیل کو ہر وارد کے متن میں درج کیا جائے۔اس کتاب کے مضامین کی فہرست پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ دردؔ نے ۶۴۸ صفحات کی اس ضخیم کتاب میں کتنے فلسفیانہ، مذہبی، عقائدی، متصوفانہ اور عارفانہ نظریات کا جائزہ کس قدر شرح وبسط سے لیا ہے۔ان دونوں کتابوں کے علاوہ (۱) نالہ درد۔ (۲) آہ سرد۔ (۳) درد دل۔ (۴) شمع محفل۔ یہ چاروں کتابیں دردؔ کے فارسی کلام پر مشتمل ہیں اور ہر ہر شعر کی دردؔ نے اپنے صوفیانہ انداز میں تشریح وتوضیح کی ہے جس سے ان کے بہت سے نظریات وعقائد پر تفصیلی روشنی پڑتی ہے۔نالہ درد میں ہر سرخی کے لئے نالے کا لفظ، آہِ سرد میں آہ کا لفظ، دردِ دل میں درد کا لفظ اور شمع محفل میں نور کا لفظ استعمال کیا گیا ہے بقول ڈاکٹر وحید اختر:

> ''ہر رسالہ علی الترتیب ۳۴۱ نالوں ، ۳۴۱ آہوں ، ۳۴۱ دردوں اور ۳۴۱ نوروں پر مشتمل ہے۔'' [۲۳]

> ''دیوان فارسی، فارسی کلام کا ایک مختصر دیوان ہے جس میں غزلوں کے علاوہ رباعیات اور مخمسات وغیرہ بھی ہیں۔ آخری چیز دیوان اردو ہے جس کو اردو شاعری کے تاج کا سب سے بڑا ہیرا سمجھنا چاہیے۔'' [۲۴]

آپ کا کلام آپ کا عکاس ہے۔آپ اچھے لوگوں کی صحبت میں رہے، خلیق وملنسار انسان تھے۔آپ کی تصانیف کے مطالعے سے آپ کے علم وعرفان اور گہرے شعور کا احساس ہوتا ہے۔آپ کی طبیعت میں جو صفات موجود تھیں جیسے فقر واستغنا، فکر وتدبیر، فیض و عرفان ، وسیع القلبی ، بلند خیالی ، پاکیزگی روح، مستقل مزاجی ، روشن ضمیر ، دور اندیشی ،

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

قناعت وصبر، یقین، استقلال وغیرہ ان تمام صفات کی تبلیغ کی ہے۔آپ کی استقلال یقین اتنا تھا کہ نادرشاہ دہلی پرحملہ آور ہوا تو آپ کے لئے شاہی محل میں جگہ خالی کی گئی اور پیغام بھیجوایا کہ خواجہ میر دردؔ وہاں تشریف لے آئیں، ایسا نہ ہو کہ ایرانی فوجیں آپ کو نقصان پہنچائیں۔آپ نے شکریہ کے ساتھ یوں لکھا:

''ہم لوگ بنی فاطمہ اور خاصکر حسینی سید ہیں۔تلوار کی آنچ سے ڈرنا نہیں جانتے، مگر زنانون کی ننگ وناموس کا خیال ہے۔امید ہے خدا جس نے حسین کی کربلا سے دمشق تک حفاظت کی تھی، وہی پاک بے نیازان سیدانو کو ہر بلا سے محفوظ رکھے گا۔'' ۲۵

جس طرح خواجہ میر دردؔ کے والد کا دل اس نمائشی زندگی سے متنفر ہوا اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر فقیری اختیار کر لی، اسی طرح آپن نے بھی ۲۹ سال تک ملازمت کی پھر بوریانشین ہوگئے۔اور جلد ہی بزرگوں کی صحبت نے اور اپنی فہم وذکاوت نے عارف باللہ بنا دیا۔چونکہ آپ کی طبیعت بھی اس طرف مائل تھی، جیسے کہ آپ ایک رباعی میں کہتے ہیں:

اے آنکہ ہمیشہ درخیال اوئ
یا طالب دولت وصال اوئ
ازخود آنہمہ کمال اورا
چوں آئینہ مظہر جمال اوئ (۲۶)

علم الکتاب، خواجہ میر درد، ص ۷۷

ترجمہ: ''اے انسان جو ہمیشہ اس کے خیالوں میں رہتا ہے۔اس کے وصل کی سعادت کا دائمی طالب گار رہتا ہے۔اس کے سارے کمالات خود اپنے آپ سے طلب کر کیونکہ تو اسی کے حسن جمال کا مظہر ہے۔''

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

خواجہ میر دردؔ نے اپنے افکار و خیالات کو بیان کرنے کے لئے انتہائی نفاست اور فصاحت کے ساتھ ضرب المثال، تشبیہات اور استعارات کو استعمال کیا ہے۔ اُن کی فنی مہارت کی یہ دلیل کیا کم ہے کہ اُن کے کہے ہوئے اشعار خاص و عام کی زبانوں پر ضرب المثل کی طرح جاری ہو جائیں۔ خواجہ میر دردؔ کی شاعرانہ عظمت اور مقبولیت کا اس بڑا اور کیا ثبوت دیا جاسکتا ہے کہ اُنکے اشعار عام بول چال میں کثرت سے استعمال ہوتے ہیں مثلاً:

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں
دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کروبیاں
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

ص ۱۶۹

خواجہ صاحب کی زبان اور طرز ادا وہی ہے جو میر تقی میرؔ نے اپنی شاعری میں استعمال کی، عبارت صاف سلیس فصیح ہر شخص کی سمجھ میں آسانی سے آتی ہے۔ درد و اثر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ دردؔ کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف قائمؔ نے اپنے تذکرہ ''مخزن نکات'' کے صفحہ ۳۸ پر کیا ہے۔ ڈاکٹر وحید اختر نے قائمؔ کے الفاظ کو نقل کیا ہے:

''چراغ کعبہ و بت خانہ، دود سوز دل پروانہ، تختہ ساز زخمِ گل، داورسِ نالۂ بلبل، حقائق و معارف آگاہ خواجہ میر متخلص نہ دردؔ سلمہ اللہ تعالیٰ مردے است عزیز و عزیزے است سراپا تمیز۔ کامل بہ جمیع کمال نمونہ قدرتِ ذوالجلال دلش گنجینۂ اسرارِ الٰہی و سینہ اش خزینہ انوار لامتناہی

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

است۔''۲۷

میر تقی میر جیسے شخص کا اپنے ایک معاصر کو اس احترام سے یاد کرنا کافی اہمیت رکھتا ہے:

''درکمال علاقگی وارستہ۔ خلیق۔ متواضع۔ آشنائے درست بزرگ و بزرگ زادہ۔ جوان صالح۔ از درویشی بہرۂ وافی دارو۔ فقیر را بخدمت او بندگی خاص است اگرچہ حسن سلوک او عام۔ حلف الصدق حضرت خواجہ ناصر صاحب سلمہ اللہ است کہ مقتدائے عالم است۔''۲۸

دیوان درد، ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی۔ مکتبہ جامعہ لمٹیڈ اردو بازار دہلی ۱۹۶۳ء

محمد حسین آزاد نے جہاں میر تقی میر کی نسبت سے خواجہ میر درد کو ''آدھا شاعر'' کی من گھڑت بات کی ہے، وہیں وہ آب حیات میں خواجہ میر درد کی عظمت کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''خواجہ میر درد اُردو کے چار رکنوں میں سے ایک رکن ہیں۔۔۔خواجہ میر درد کی غزل سات شعر نو کی ہوتی ہے مگر انتساب ہوتی ہے، خصوصاً چھوٹی بحروں میں جو اکثر غزلیں کہتے تھے گویا تلوار کی آب داری نشتر میں بھر دیتے تھے، خیالات اُن کے سنجیدہ اور متین تھے۔''۲۹

آزاد محمد حسین، آب حیات، ص ۱۸۵

میر حسن دہلوی صاحب ''سحر البیان''، ''تذکرہ شعرا اردو'' جس کا زمانہ تالیف ۱۱۸۸ھ سے ۱۱۹۲ھ تک ہے اس تذکرے میں خواجہ میر درد کی شاعری کے بارے میں یہ بیان تحریر کیا ہے:

''بر آسمان سخن مانند خورشید فرد، حضرت خواجہ میر المتخلص بہ

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

درداز عالمان خوش ذات واز درویشان نیکو صفات ۔۔۔'' ۴۰

میر حسن دہلوی، تذکرہ شعرا اردو، ص ۴۷ اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ

خواجہ میر دردؔ نے اردو غزل کو صوفیانہ مسائل سے جس انداز میں متعارف کرایا ہے، اُس سے صاحب کمال نے نہ صرف خود کسبِ فیض حاصل کیا ہے بلکہ اس سے نئے سانچے بھی وضع کیے ہیں جن کو کلام میں لائے بغیر کوئی شاعر معیاری صوفیانہ شاعری نہیں کر سکتا۔ خواجہ میر دردؔ نے گلشن شعر میں جو دیپ جلائے ہیں اُن کو انقلابات کی تند و تیز ہوائیں بھی نہیں بجھا سکیں۔

میں کس طرح بتوں کے لا سامنے جھکا دوں
دل تو دماغ اپنا کھینچے ہے آسماں پر،

ص، ۱۰۵

☆☆☆

نہ ہم غافل ہی رہتے ہیں نہ کچھ آگاہ ہوتے ہیں
انہی طرحوں میں بس ہر دم فنا فی اللہ ہوتے ہیں

ص، ۱۱۶

نہ مطلب ہے گدائی سے نہ یہ خواہش کہ شاہی ہو
الٰہی ہو وہی جو کچھ کہ مرضی الٰہی ہو

خواجہ میر دردؔ نے افکار و عمل کو ایک منفرد اسلوب میں پیش کر کے اِن کی بدولت اپنے عہد کے شعر و ادب کو پوری طرح متاثر کیا، خواجہ میر دردؔ نے اپنے عہد کے زوال پذیر معاشرے میں زندگی کی ایسی لہر دوڑا دی جس نے زوال و انحطاط پذیر معاشرتی رویوں کو ایک بار پھر آشنائے حیات کر دیا۔ معاشرے کے وہ افراد جو زوال کے سبب گھٹاٹوپ اندھیروں

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

میں بھٹک رہے تھے وہ نئی امنگوں اور امیدوں سے ہمکنار ہوئے۔ خواجہ میر دردؔ ایک شاعر ہی نہیں ایک عہد ساز عظیم انسان، فکر جداگانہ رکھنے والے مفکر، صاحب علم بزرگ، بلند مرتبہ درویش اور بلند پایہ مصنف ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ایسی عہد آفرین اور تاریخ ساز شخصیت کے مالک بھی تھے جو پوری طرح اپنے عہد کو متاثر کرنے کا سلیقہ جانتے تھے۔

خواجہ میر دردؔ کا تصورِ تصوف:

میر دردؔ کو بچپن سے ہی علما اور صوفیا کی مجالس میں بیٹھنے کا موقع ملا بالفظ دیگر دردؔ کی آنکھ ایک مذہبی ماحول میں کھولی اور اُن کی تربیت خالص دینی اور صوفیانہ ماحول میں ہوئی تھی۔ میر دردؔ نے جس عہد میں ہوش سنبھالا دراصل وہ دور ہر لحاظ سے انتشار اور زوال پذیر کا عہد تھا، اور تصوف ہمیشہ انحطاط پذیر معاشرے میں جنم لیتا ہے۔ تصوف کو پروان چڑھانے کے لئے اس سے اچھا دور کوئی نہیں تھا اس دور کے ادب میں تصوف جا بجا ملتا ہے لیکن اسی دور کا ادب ''زرتشت اور ویدانت'' کے اثرات سے ذائل ہوا۔ اسی زمانے کی شاعری میں عشق مجازی کو عشق حقیقی کے لئے سنگ میل تصور کرنے کی بنیاد پڑی تھی۔ ظاہر ہے عشق حقیقی کو حاصل کرنے کے لئے عشق مجازی سے گذرنا پڑتا ہے۔ خواجہ میر دردؔ کے والد ناصر عندلیب نے جس مسلک (سلسلے) کو اپنایا اور تصوف کے دو مکتب '' وحدۃ الوجود'' اور'' وحدۃ الشہود'' کی بنیاد رکھی تھی، دردؔ بھی اسی راستے پر چلے لیکن '' وحدۃ الشہود'' مکتب کی تعلمات پر زیادہ یقین رکھا اور اسے فروغ دینے کی سعی کی۔ لیکن اس بات کا اعتراف بھی بجا ہے کہ ان کے کلام میں دونوں نظریوں کی جھلک ملتی ہے، کبھی الگ الگ اور کبھی ساتھ ساتھ چلتی ہوئی۔

خواجہ میر دردؔ وحدت الوجود کی تردید نہیں کرتے اور نہ ہی تائد کرتے ہیں۔ آپ کے نزدیک انا الحق کا نعرہ لگانا بڑی بات نہیں بلکہ اللہ کا بندہ بننا اور رسول صلی اللہ وسلم کا صحیح

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

پیروکار بننا ہے۔

وحدت الشہود کے بارے میں آپ نے وضاحت سے تحریر کیا ہے۔

''اِدھر اُدھر ہر طرف اس کے ظہور کے سوا اور کچھ نہیں۔ ہر چند کہ آئینہ میں وہی جلوہ گر ہے اور آئینے میں عکس بھی اس کی صورت کے علاوہ کسی اور کا نہیں لیکن کسی شخص کا چہرہ بغیر کسی واسطے کے جیسا کہ وہ ہے نہیں دیکھا جا سکتا یعنی اس وجہ سے کسی غیر کے چہرے کا عکس تو اس شخص کا چہرہ نہیں ہو سکتا۔ سو ظاہری آنکھ اسے دریافت نہیں کر سکتی۔ جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے کہ ''اُس کو تو کسی کی نگاہ محیط نہیں ہو سکتی اور وہ سب نگاہوں کو محیط ہو جاتا ہے، اور وہی بڑا باریک بین اور باخبر ہے۔'' [۱]

بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی۔

''خواجہ میر دردؔ نے ان دونوں نظریوں کو ایک سنگم پر لا کھڑا کر دیا۔ کیونکہ ان دونوں نظریوں کی منزل ایک ہی ہے اور وہ ہے عرفان الٰہی۔'' [۲]

خواجہ میر دردؔ کہتے ہیں کہ:

ہے جلوہ گاہ تیرا کیا غیب کیا شہادت
یاں بھی شہود تیرا واں بھی حضور تیرا

وحدت میں تیری حرف دوئی کا نہ آ سکے
آئینہ کیا مجال تجھے منہ دکھا سکے

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

اے دردؔ مثل آئینہ ڈھونڈھ اس کو آپ میں
بیرون در تو اپنی قدم گاہ بھی نہیں

بعد میں جب نظریہ بدلہ تو کہہ اُٹھے:

خاموش ہو مت جتا کسو کو
آتا ہے نظر خدا کسو کو

تصوف میں ذات باری تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے اور عرفان و معرفت کی راہوں میں جس قدر منازل پیش آتی ہیں اور اُن منازل کو پانے کے لئے صوفی کو جن حالات و مشکالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور جن کٹھن مراحل سے گذر کر ایک صوفی اپنے مقصود کو پانے کے قابل ہوتا ہے۔ خواجہ میر دردؔ نہ ان تمام پہلوؤں سے اچھی طرح واقف تھے۔ دردؔ عام صوفیاء میں سے نہیں تھے جو ترک دنیا کر کے ذاتی سکون و سلامتی کے گنبد میں جا بیٹھے ہیں۔ آپ کا دنیا سے اتنا تعلق تھا جس قدر جسم و روح کا۔ اگر چہ آپ کی مجلس کوئی عام مجلس نہیں تھی بقول دردؔ:

ہماری بزم میں ہوتا ہے
اور ہی ذکرِ سلطانی کا

آپ تصوف کے آسمان پر چمکتے ستارے کی مانند تھے جس کی روشنی دور دور تک حرارت کا ذریعہ بنی رہی، جس کا اعتراف متعدد مفکرین نے یوں کیا ہے بقول میر حسن:

''اکثرے از دست عسرت پریشان شدہ بطرفہ رفتند لیکن آں ثابت قدم تکیہ بر توکل نمودہ قدم از جا بر نداشت تا حال در شاہجہان آباد مقیم است۔''۴۳

خواجہ میر دردؔ تصوف اور شاعری، ص ۷۸

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

قائم چاند پوری نے سرخوش میکدہ، خدا پرستی، میکش معطبہ سپاہ، ہستی حقائق ومعارف آگاہ کا منبع قرار دیا ہے۔ میر حسن نے دردؔ کے دل آگاہ کو اسرار خدائی کا مخزن قرار دیا ہے۔ شفق اورنگ آبادی نے آپ زیارت کو عبارت قرار دیا ہے۔ احمد یکتا نے آپ کو مثل آفتاب کہا جسے تمام ہندوستان والے جانتے ہیں۔ میر تقی میرؔ نے آپ کو قافلہ اہلِ خضر بتایا ہے۔ ڈاکٹر سید اعجاز حسین کے مطابق:

"میر دردؔ اور میر تقی میرؔ وسیع معنوں میں بڑے صوفی شاعر تھے، ان کے خیالات کی بنیاد حقیقت وخلوص پر ہے۔"۴۴

اردو شاعری کا سماجی پس منظر، ص ۲۴۶، نیشنل آرٹ پرنٹرس، الہ آباد ۱۹۶۸

خواجہ میر دردؔ نے تصوف کے حالات وواردات کو جامۂ شعر پہنانے میں ہر جگہ احتیاط سے کام لیا ہے وہ کبھی بھی اپنی زبان کو مجذوبوں اور مغضوب الحال صوفیا کی طرح آلودہ کلماتِ ادبانہ نہیں ہونے دیتے۔ یہ ضبط واحتیاط اسی لئے ہے کہ دردؔ نے تصوف کو صرف شاعری کے لئے اختیار نہیں کیا تھا بلکہ وہ سالکان راہ حق کے قافلہ سالار بھی تھے:

ہوں قافلہ سالار طریق قدما دردؔ یوں نقش قدم خلق کو میں راہ نما ہوں

انھوں نے شعر کو ذریعہ عزت وشہرت اور سلسلہ معاش نہیں بنایا نہ انھوں نے کبھی کسی کی ہجو کی نہ قصیدہ خوانی ۔۔۔ دردؔ نے تصوف کو صرف شاعری ہی میں استعمال نہیں کیا بلکہ عملاً برتا، بقول ڈاکٹر سلیم اختر۔

"دردؔ کے لئے تصوف، برائے گفتن نہ تھا، ان کا کلام جس الفت الٰہی، توکل، تسلیم اور رضا اور انسان دوستی کی تلقین کرتا ہے۔ ان کی زندگی ان سب اوصاف سے منصف تھی"۴۵

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

ذیل میں ان اشعار کو دیکھئے جو توحید و معرفت، الفت الٰہی وغیرہ وغیرہ کے راز ہائے سر بستہ کھولتے ہیں۔

بستے ہیں ترے سائے میں سب شیخ و برہمن
آباد تجھی سے ہے گھر دیر وحرم کا

ہے خوف اگر جی میں تو ہے تیرے غضب سے
اور دل میں بھروسہ ہے تو ہے تیرے کرم

ہے جلوہ گاہ تیرا کیا غیب کیا شہادت
یاں بھی شہود تیرا واں بھی حضور تیرا

موجود پوچھتا نہیں کوئی کسی کے تئیں
توحید بھی تو ہوتی نہیں ہے عیاں ہنوز

تیرا ہی حسن جگ میں ہر چند موجزن ہے
تسپر بھی تشنہ کام دیدار ہیں تو ہم ہیں

نہ ملا ہمیں کوئی نکتہ داں یہ بیت سنا دیں بھلا کہاں
نہ ہوا سبھوں پہ عیاں جو کسی سے یاں تو نہاں نہیں

جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

حجابِ رُخِ یار تھے آپ ہی ہم
کھلی آنکھ جب کوئی پردہ نہ دیکھا

ہر جز کو کل کے ساتھ۔۔۔ ہے اتصال
دریا سے در جدا ہے پر ہے عرق آب میں

منظورِ زندگی سے ہی دیکھنا تھا
ملتا نہیں جو تو ہی پھر کیا ہے زندگانی

قاصد نہیں یہ کام تیرا اپنی راہ لے
اس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے

مرا تو جی وہی رہتا ہے جہاں تو ہے
اگرچہ میں یہ نہیں جانتا کہاں تو ہے

نظر میرے دل کی پڑی درد کس پر
جدھر دیکھتا ہوں وہی روبرو ہے

غافل جہاں کی دید کو صفتِ نظر سمجھو
پھر دیکھتا ہے اس عالم کو خواب میں

غافل خدا کی یاد یہ مت بھول زینہار
اپنے تئیں بھلا دے اگر تو بھلا سکے

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

عرض و سما کہاں تیری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

کیا فرق داغ و گل میں کہ جس میں بو نہ ہو
کس کام کا وہ دل ہے جس دل میں تو نہ ہو

ملاؤں کس کی آنکھوں سے کہو اس چشم حیراں کو
عیاں جب ہر جگہ دیکھوں اسی کے راز پنہاں کو

آئینے کی طرح غافل کھول چھاتی کے کواڑ
دیکھ ہے تو کون بارے تیرے کاشانے کے بیچ

وائے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

مدرسہ یا دیر یا کعبہ تھا یا بت خانہ تھا
ہم سبھی مہمان تھے واں تو ہی صاف خانہ تھا

خواجہ میر دردؔ نے اپنے ان صوفیانہ نظریات اور خیالات کو پیش کرنے اور ان کے ابلاغ کی خاطر اپنی شاعری میں ایک مکمل فلسفیانہ نظام قائم کیا ہے۔ اس فلسفیانہ نظام کی بدولت اُن کی شاعری میں وسعت اور گہرائی پیدا ہوگئی ہے۔ ان کی شاعری میں تصوف کے موضوعات محض رسمی اور روایتی نہیں ہیں بلکہ اُن میں خلوص و صداقت کی چاشنی پائی جاتی ہے آپ نے اپنی شاعری میں عرفان ذات اور تصوف کے پیچیدہ اور مشکل مضامین کو انتہائی دلکش اور نفاست سے بیان کیا ہے۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

ڈاکٹر سید عبدالباری اردو زبان وادب کے مزاج شناس

قدم اُٹھیں تو منزلوں کے سراغ ملتے ہیں اور قلم اُٹھیں تو دل ونظر کی دنیا تسخیر ہوتی ہے۔ ڈاکٹر سید عبدالباری جو اوائل میں ''شبنم سبحانی'' کے نام سے شعر گوئی کرتے تھے۔ اردو ادب میں ہمارے لئے اجنبی نہیں ہیں۔ آپ قلم کے مجاہد اور اردو زبان وادب کی ترویج واشاعت کو اپنے لئے باعث فخر تصور کرتے تھے۔ اردو زبان وادب کی ترویج واشاعت کے سفر میں اپنے قلم کو اور قدم کو کبھی ستانے کی اجازت نہ دی۔ ڈاکٹر سید عبدالباری کی ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز ان کے طالب علمی کے زمانے 1953ء سے ہوتا ہے جب انہوں نے ''من کا دیوتا'' ایک نظم لکھی، بعد اس کے مختلف جرائد میں ان کی شاعری شائع ہوتی رہیں۔ ڈاکٹر سید عبدالباری کی زندگی اور قلمی جہاد آپس میں اس طرح رچی بسی ہوئی ہیں کہ ان کو ایک دوسرے سے جدا کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ ادبی دنیا میں جس مقصد کو وہ آگے لے کر بڑھتے ہیں وہ ہے اردو زبان وادب کا تحفظ اور اس کی ترقی کی خواہش، جس کے لئے وہ آخیر تک سرگرم رہے۔ سید عبدالباری کی ادبی خدمات کا مختصر تعارف پیش ہے۔

1۔ لکھنوء کا شعروادب (1857ء تک)۔

2۔ لکھنوء کے ادب کا معاشرتی وثقافتی پس منظر (1857ء تا 1947ء)۔

3۔ ہندوستانی تہذیب اور اردو۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

4۔ آزادی کے بعد اردو شعر و ادب۔

5۔ ادب اور وابستگی۔

6۔ نقد نو عیار۔

7۔ افکار تازہ۔

8۔ کاوش نظر۔

9۔ آداب شناخت۔

10۔ ملاقاتیں۔

11۔ جلوے ہیں بے شمار، وغیرہ وغیرہ کے علاوہ آپ کی تقریباً 22 تصانیف ہیں۔ آپ کی تصانیف سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کسی ایک دائرہ عمل کے پابند نہیں تھے بلکہ انہوں نے شاعری اور نثر کے علاوہ تحقیق وتنقید کے میدان میں بھی اہم کارنامے انجام دیئے جن کا احاطہ کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

ڈاکٹر سید عبدالباری گہرے شعور کے مالک تھے اور انھیں اس بات کا علم تھا کہ کسی بھی معاشرے کی تہذیب وثقافت سے زبان کو الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ چنانچہ انہوں نے لکھنوء کے شعر و ادب کے معاشرتی، ثقافتی اور تہذیبی پس منظر کی طرف زیادہ توجہ دی اور تاریخی حقائق کو سامنے رکھ کر کے ایک ناقدانہ بحث کی ہے۔ آپ نے ''اردو ادب کا تہذیبی تناظر'' کتاب لکھ کر اردو ادب کی تاریخ کو تہذیب کے آئینے میں دیکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور اردو زبان جن مراحل سے گزری ہے ان کا جائزہ پیش کیا ہے۔ دیگر ماہرین لسانیات کے اس وقت تک موجود نظریات کو خصوصی طور پر سامنے رکھا اور ان پر اپنی ماہرانہ رائے کا اظہار کرتے ہوئے کھڑی بولی کو اردو کا مخزن قرار دیتے ہیں:

"دہلی کے آس پاس بولی جانے والی زبان نے کھڑی بولی کا منجھا ہوا

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

روپ انہیں کے سہارے حاصل کیا ہے جو بعد میں اردو کا مخرج
ثابت ہوئی‘‘۔[۱]

ڈاکٹر سید عبدالباری اردو زبان کے آغاز وارتقاء پر گہری نظر رکھتے ہیں اور اس کی تاریخی، سیاسی، سماجی، تہذیبی اور ثقافتی اہمیت پر تفصیل کے ساتھ بحث بھی کرتے ہیں۔ آپ جو بھی نظریہ پیش کرتے ہیں اس میں ایک منطقی انداز اختیار کرتے ہیں اور اپنے خیالات کو انتہائی مدلل انداز میں واضح کرتے ہیں۔ آپ نے تہذیب کے آئینے میں فاتح اور مفتوح کے باہمی تعاون اور اشتراک کو دیکھتے ہوئے افغان اور ترک کو مغلوں پر ترجیح دی ہے:

’’مغل ہندوستان آئے وہ اپنے ساتھ پائیدار تہذبی قدریں نہیں لائے۔ ان کی تہذیب پر جاگیردارانہ شہنشاہیت کا رنگ چڑھا ہوا تھا جو جو یہاں آکر اور گہرا ہو گیا۔ اسلام کی روح سے مغل اتنے نزدیک نہ تھے جتنا افغان اور ترک تھے‘‘۔

اردو زبان کی نشو نما میں صوفیاء کرام کے کردار کو انتہائی اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ یہ ہی وہ لوگ تھے جن کا عوام کے ساتھ براہ راست رابطہ تھا۔ یہ صوفیا عوام کے مزاج شناس تھے اور انسانی نفسیات کا گہرا ادراک رکھتے تھے۔ انہوں نے بہت جلد محسوس کر لیا تھا کہ عوام کے دلوں کو موہ لینے کے لئے ان ہی کی زبان سب سے زیادہ کارگر ثابت ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹر سید عبدالباری لکھتے ہیں:

’’مسلمان صوفیاء کا یہ بڑا ایثار تھا کہ انہوں نے اپنی مادری زبان فارسی یا عربی کو بالائے طاق رکھ کر یہاں کی " گھر بھاکا" جو گھورے کی چیز سمجھی جاتی تھی اٹھالی ورنہ اس وقت اہل علم کے لئے اسے منہ لگانا ننگ و عار تھا۔‘‘[۳]

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

یہ دور ظاہر ہے اردو زبان کا تشکیلی دور تھا۔ مغلوں نے جب دکن فتح کیا تو حسن و عشق اور عیش و عشرت کا دریا رواں تھا۔ بر عکس اس کے صوفیاء کرام نے خود کو دور رکھا اور صرف زبان وادب کی ترویج وترقی اور لطافتوں سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ اس متصوفانہ عہد کے حوالے سے ڈاکٹر سید عبدالباری اپنی شکایت کا اظہار یوں کرتے ہیں :

''اس تہذیب کی بنیاد کمزور اور اس کی اقدار سطحی تھیں نیز تصوف کے ذریعہ جو کچھ پیش کیا گیا تھا وہ رواداری اور اختلاط کی وجہ سے فکری طور پر مبہم اور غیر واضح ہو کر رہ گیا تھا۔''[۴]

اگر دیگر الفاظ میں یہ بھی کہا جائے کہ اردو زبان وادب کی ترقی وترویج میں صوفیاء کرام کا احسان نا قابل فراموش ہے تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہوگا۔ تصوف نے عام بول چال کی زبان کو ادبی رنگ دینے میں بڑی مدد کی اور عوامی تمدن کے بہت سے پہلوؤں کی نمائندگی بھی کی ہے۔

شمالی ہند میں اردو زبان وادب کو ایک مخصوص سمت دینے کا سہرا ولی دکنی کے سر جاتا ہے جس سے کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا۔ فارسی آمیز اس دور میں شش و پنج میں قید شعراء کو ایک حوصلہ بخشنے کی حیثیت سے ولی کی دہلی میں آمد ہوئی، جو اپنے ساتھ دکنی تہذیب وادب کو بھی لے کر آئے۔ بقول عبدالباری:

''تہذیب وادب کے مرکز کو دلی لے جانے میں ولی ؟ کا بھی بڑا ہاتھ ہے یہ اردو زبان کا پہلا مکمل شاعر ہے جس کے بنائے ہوئے شعر و سخن کے سانچے آج بھی رائج ہیں۔ ان کے اشعار اس وقت کی تہذیبی کش مکش اور انتشار کو نمایاں کرتے ہیں، تغزل کا اولین سانچہ ولی ؟ نے بنایا تھا۔''[۵]

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

دہلی میں اردو شعر ادب کی کونپلیں جس طرح پھوٹ رہی تھیں انھیں مزید تازگی بخشنے والوں میں ولی کے بعد حاتم اور آبرو کے نام نمایاں ہیں۔ گو کہ یہ عہد ایہام گوئی کا غماز ہے جس کے حوالے سے سید عبدالباری نے لکھا ہے کہ ''اس دور میں تہذیبی زندگی کا کوئی نمایاں عکس بھی شاعری میں نہیں ملتا ہاں بعض اشارے کہیں کہیں مل جاتے ہیں۔''[6] اس کے بعد ایک طرف میرؔ، دردؔ اور سوداؔ کا وجود ہوا تو دوسری طرف افغانوں، مراہٹوں اور انگریزوں کے ہاتھوں انتشار، مذہبی، طوائف الملوکی اور پر آشوب زمانہ تھا۔ غربت وافلاس، یاس و نا اُمیدی کی گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ اس انارکی اور انتشار کے دور میں میرؔ، دردؔ اور سوداؔ کا صحت مندانہ کلام دردِ انسانیت کا محور بنا۔ لیکن سید عبدالباری اس دور سے متعلق یہ لکھتے ہیں:

> ''یہ اگرچہ زندگی کا کوئی تعمیری خاکہ پیش نہ کر سکے مگر اس دور کی تمام خامیوں پر انگلی رکھ دی اور تمام دکھوں کی نشاندہی کر دی۔''[7]

ظاہر ہے دہلی پر پے در پے حملے ہو رہے تھے اور شہنشاہ آئے دن بدل رہے تھے، خوف و دہشت، قتل و غارت کا ماحول تھا۔ جس کا عکس اس دور کے شعر و ادب میں صاف دکھائی دیتا ہے۔ درد و اثر، جوش، سوز و گداز، گرمی و تاثیر اور متانت و ثقافت سے معمور نظر آئے گا۔ فن کاروں کو ایسا ماحول راس نہ آیا تو انہوں نے لکھنوء کا رخ کیا۔ جہاں آصف الدولہ کی سرپرستی حاصل تھی اور ہر سوں عیش و عشرت، داد و دہش، رنگ و نور کی فضا میسر تھی۔ لکھنوء کے اس دورِ اول میں مصحفی، جرات، انشا ور نگین کی حکمرانی رہی۔ انھیں کے دور میں اگرچہ میر، سودا، حسرت، سوز وغیرہ بھی آچکے تھے مگر لکھنو کے ترجمان نہ بن سکے۔ لکھنوء کی اس محفل طرب میں جو ادب تخلیق کیا گیا اس کی معنویت اور اہمیت کے حوالے سے سید عبدالباری نے یہ لکھا ہے:

> ''اس دور میں جو کچھ لکھا گیا اس کی تاریخی اہمیت ہو تو ہو مگر اخلاقی اہمیت بالکل نہیں۔ وہ ہندوستان کی تہذیبی ترقی میں کسی بھی حیثیت

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

سے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔"[8]

ظاہر ہے آصف الدولہ نے اس دیار میں کشاکشی اور ظلم رسیدہ دلوں جن سے درد کی لے بکھر رہی تھی کے لئے ایک تصنع، عیش اور مصنوعی پلیٹ فارم کا اہتمام کیا تھا۔ جس کے ملتے ہی ان کے دل نشاط انگیز دھن میں متحرک ہو گئے۔ اس ماحول میں جو ادب تخلیق کیا گیا اس کے متعلق رام بابو سکسینہ نے یہ کہا تھا کہ "ادب کی تاریخ میں یہ دور ایک داغ تھا۔" تاہم سید عبدالباری متفق نہ ہوتے ہوئے لکھتے ہیں:

"زندگی محض درد و غم ہی نہیں نشاط و مسرت اس کا ایک اہم جز و ہے اگر اس میں عیاشی نہ شامل ہو۔ لکھنوء کی تہذیب میں تعیش خود فراموشی و رنگینی کے ساتھ ہی ساتھ بعض قابلِ قدر صحت مندانہ رجحانات بھی پائے جاتے تھے۔"[9]

لکھنوء کی اس محفل طرب میں شامل انشاء و مصحفی اور آتش و ناسخ کے ادبی کارناموں سے کوئی ناواقف نہیں۔ ان شعراء کے اشعار کا اگر مطالعہ کریں تو زمانے کے صبر آزما مصائب والم کے لئے بے دست و پائی کا بھی احساس ہوتا ہے۔ گو کہ اپنے ہم عصر شعراء کا تتبع، انداز فکر اور رجحانات کا انعکاس ملتا ہے۔ اس دور میں سب سے زیادہ جو اصناف سخن نمو پذیر ہوئیں ان میں غزل، مثنوی، مرثیہ، ریختی اور واسوخت وغیرہ تھی۔ غزل کے ساتھ ساتھ داستان گوئی، مثنوی پڑھنے اور مشاعروں کا اہتمام بھی ایک ادبی مشغلہ تھا۔ اس دور کی خصوصیات کو اگر مختصراً بیان کیا جائے تو اس اسکول میں ادب کا رخ بزم عشرت کی رنگینیوں کی طرف مڑ گیا تھا ظلم رسیدوں کی کہانی کون سننے کو تیار ہوتا۔ سرخوشی و سرمستی کے علاوہ زیورات نسوانی اور اعضائے بدن کا ذکر باعث فخر سمجھا جاتا تھا۔ طوائفیں، رقاصیں اور اوباش عورتیں خوش حال طبقہ کی زندگی میں داخل ہو گئی تھیں۔ شاعر لوگ ایک دوسرے پر

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

فوقیت پانے کے لئے سراپا نگاری، صناعی، نازک اور لفظی پینترے بازی میں اُلجھ کر رہ گئے تھے۔ سیدھی سادھی بات کو پیچیدہ بنانا اس عہد کے فنکار کا مطمحِ نظر تھا۔ اس دور کی غزل گو مہاجرین شعرا کے حوالے سے محمد حسین آزاد کا یہ فقرا یاد آتا ہے کہ ''انشا کے فضل و کمال کو شاعری نے کھو دیا اور شاعری کو سعادت علی خاں کی صحبت نے ڈبو دیا۔''

مثنوی جو موضوعات کے اعتبار سے قصیدہ، غزل اور مرثیہ کے مقابل ہمہ گیر اور لامحدود ہے۔ یہ داخلی اور غنائی کے بجائے خارجی یا بیانیہ شاعری کی معراج ہے۔ اس میں واقعات نگاری، مناظر قدرت کی عکاسی، جزئیات نگاری، جذبات نگاری، مافوق الفطری باتوں کے ساتھ تخیل کی بلند پروازی بدرجہ اتم موجود ہے۔ ڈاکٹر سید عبدالباری جس عہد کی مثنوی کا مطالعہ کرنے جا رہے ہیں اس کا عہد کا ذکر یوں کرتے ہیں:

''ہم جس عہد اور جس مقام کی مثنویوں کا مطالعہ کرنے جا رہے ہیں وہ عہد اور وہ مقام رزم کے لئے نہیں بزم کے لئے شہرت رکھتا ہے۔ چنانچہ اس عہد میں ایک بھی رزمیہ مثنوی ہندی فارسی یا انگریزی ادب کے رزمیہ ادبی شاہکاروں کے بالمقابل وجود میں نہ آسکی نیز یہ عہد تصوف کے عروج کا عہد نہیں تھا بلکہ تصوف توہمات اور رسوم کے گرد وغبار میں چھپ گیا تھا۔'' ۱۰

ایک اور جگہ عبدالباری نے لکھا ہے:

"اس عہد کی مثنویوں میں جنسی تلذذ اور عریانی و بے حیائی کے مناظر صاف طور پر سامنے آتے ہیں اور جس طبقہ میں اس کی پذیرائی ہوئی تھی اس کے ذوق کا اندازہ ہوتا ہے۔'' ۱۱

آل احمد سرور لکھتے ہیں:

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

"اس عہد کی مثنویوں میں عورتوں کی جیتی جاگتی تصویریں ہی ملتی ہیں
جو ہیجانِ عشق نے بنائی ہے۔"[12]

یہ صداقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ مرثیہ غیر ملکی صنف سخن ہے لیکن اس صنف کو ایک باقاعدہ عروج بخشنے میں لکھنوء کا مرکز ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ لکھنوء میں ہی اس صنف کے اسالیب اور ڈھانچہ تیار ہوا۔ لیکن عبدالباری کے الفاظ میں یہ کہ "مرثیہ جیسی صنف سخن بھی اس عہد کے مذاق میں رنگ کر کچھ طلسم ہوشربا کا انداز اختیار کر چکی تھی۔"[13] اس دور کے کامیاب مرثیہ گو شعراء میں ناسخ اور آتش کے بعد میر انیس اور مرزا دبیر کا شمار ہوتا ہے۔

ناسخ جسے تمثیل نگاری کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ انانیت پرست اور خوددار انسان تھا۔ اپنے محسنوں اور کرم فرماؤں کی خاطر جلاوطنی کی زندگی گزارنے پر آمادہ ہوگئے لیکن درِ غیر پر سجدہ نہ کیا۔ غالب جیسے بڑے شاعر بھی آپ کے کلام کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور راہ و رسم رکھتے تھے۔ شائد یہی وجہ ہے کہ غالب کے ابتدائی کلام میں مشکل پسندی اور پیچیدگی، پھر تمثیلی انداز پایا جاتا ہے۔ غالب نے ایک طرف مغلیہ سلطنت کے زوال کی وجہ سے بیشتر مصائب کا سامنا کیا تو دوسری طرف اپنے ہم عصر شعراء کی طعنہ کشی کو بھی سہا۔ جب تک غالب بیدل اور شاہ نصیر کی طرز پر شعر کہتے رہے تب تک ان کے ہم عصر انھیں مہمل گو کہتے رہے۔ مرزا غالب زندگی میں ان مہیب ساؤں سے محروم و مایوس نہیں ہوئے بلکہ ڈٹ کے مقابلہ کیا۔ لکھنوی ہم عصروں کی روش سے اپنے دامن کو بچاتے ہوئے غالب نے جدت اختیار کی اور سادگی، اصلیت کا دامن پکڑ لیا۔ غالب کے نئے ڈھنگ کا اعتراف کرتے ہوئے سید عبدالباری نے لکھتے ہیں کے:

غالب اپنے ابتدائی دور کے طرزِ سخن تک اگر خود کو محدود کر لیتے تو ناسخ
کے ہمزاد بن کر رہ جاتے۔"[14]

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

غالب کی ثابت قدمی سے متعلق ابن فرید نے لکھا ہے۔

''زندگی کے جولا نگاہ میں جو شخص بیک وقت اتنے رخوں سے نا مساعدت کا سامنا کرے اور پھر بھی زندہ رہے اور زندگی کا ثبوت دے وہ معمولی اعصاب کا انسان نہیں ہوسکتا ورنہ اس کا حشر بھی وہی ہوتا جو مرزا یوسف کا ہوا۔ غالب کو اس لحاظ سے آہنی اعصاب کا حامل قرار دیا جاسکتا ہے۔'' ۱۵

زبان کی ثقالت اور علمی اصطلاحات میں غالب اور ناسخ بہت حد تک یکسوئی رکھتے ہیں۔ ناسخ مشکل پسندی کے شیدائی تھے اور تصوراتی دنیا بسانے میں ان کا کوئی جواب نہیں تھا۔ پروفیسر شبیہ الحسن کے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''جذبہ کے فقدان کے سبب پروفیسر صاحب نے ناسخ وغیرہ کے ان تمثیلی مصنوعات ومخلوقات کی تشبیہ ایسے یخ بستہ پیکروں سے دی جو بہت جلدی گھل مل کر ختم ہوجاتے ہیں۔'' ۱۶

اس سے ظاہر ہے کہ جب فن کار کے پاس ایک مخصوص پیغام نہ ہو، مخصوص طرز سخن کا پابند نہ ہو، مسائل کا فقدان ہو، شعور کی پستی ہو، صرف منہ کا مزہ بدلنے کے لئے اپنی قادر الکلامی کا مظاہرہ کرنے کے لئے ہر رنگ کا عادی ہو تو ایسے حالات میں جنم لینے والا ادب بہت کم زندگی پاتا ہے۔ ادیب تخلیق کو صناعی بنانے کی خاطر سارا زور اس کی ظاہری خوبصورتی یعنی الفاظ وتراکیب اور طرز ادا کی ندرت پر لگاتا ہے۔ یہ ہی رنگ لکھنوی ادب میں بھی ملتا ہے یہاں مقصود صرف الفاظ کے کرشمے دکھانا تھا، خیال کس رتبے کا ہے اس سے کوئی غرض نہیں۔ سید عبد الباری لکھتے ہیں:

''الفاظ کی اس پرستش کے سبب ناسخ فکر ونظر کی افسوس ناک سطحیت

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

کے شکار ہوگئے ہیں اور ایک ایسے معاشرہ کے ترجمان بن گئے ہیں
جس میں صرف جسم ہی جسم ہے دماغ کا پتہ نہیں۔'' ۱۷

ناسخ کی ایک خاص خاصیت یہ رہی کہ جس طرح کی طرب فضا انھیں میسر تھی ایسے ماحول میں بھی ان کے لئے اخلاقی تعلیمات محترم تھیں۔ انھوں نے کہیں بھی جرات، انشا اور رنگین کی طرح یا بعد میں امانت کی طرح شاعری کو فحاشی یا ہوسنا کی کے مضامین سے داغدار نہیں کیا۔ ان کی اس خصوصیت کو پروفیسر نونہروی نے واضح انداز میں یوں لکھا ہے:

''ناسخ نے اس غزل کو اس ماحول میں سنجیدہ و با اتفاق بنا دیا۔ ان کا کلام پھوڑ پن، گندگی عریانی، فحش معاملہ بندی، رکاکت اور ہوسناک جنسیت سے جس قدر پاک ہے اتنا دوسرے شاعروں کا کلام نہیں۔'' ۱۸

لیکن عجیب ستم ظریفی یہ دیکھئے کہ پروفیسر عابد علی عابد نے لکھنوی اسکول کی شاعری کے دفاع میں ناسخ کو شاعر ہی تسلیم نہیں کیا:

''ناسخ کے کلام سے استشہاد غلط ہے اس لئے کہ ان کو تو شاعر ہی تسلیم نہ کرنا چاہیے اور نہ وہ لکھنوی شعرا کے نمائندہ ہیں۔ وہ مشاق قافیہ پیما اور الفاظ و تراکیب کے شعبدہ گر تھے۔'' ۱۹

اس نقطہ نظر کا جواب دیتے ہوئے عبدالباری نے یہ لکھا ہے " لیکن یہ نہایت انتہا پسندانہ نقطہ نظر ہے۔ ناسخ پورے لکھنوی معاشرہ کے نہ سہی لیکن اس کے بڑے حصہ کی ضرور نمائندگی کرتے ہیں اور ہر ذوق اور فکر کے لوگوں کے لئے ان کے یہاں دلکشی کا سامان موجود ہے۔ اپنی عملی زندگی میں بھی وہ اخلاقی اعتبار سے دیگر شعراء سے بلند تھے۔ بعض

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

ناقدین نے آتش اور ناسخ کے اس دور کو لکھنوء میں دو مختلف اسکول ہونے کا اعتراف کیا ہے جو ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ چنانچہ مولانا عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں:

''دہلی و لکھنو کے ساتھ ساتھ ناسخ اور خواجہ آتش نے الگ الگ رنگ اختیار۔ کیے اس لئے خود لکھنوء میں بھی دو اسکول قائم ہو گئے۔''[۲۱]

میر انیس اور مرزا دبیر کی مرثیہ نگاری کا دور لکھنوء کی ثقافتی زندگی کے عروج کا دور تھا۔ ان دو بڑے مرثیہ نگاروں پر اردو ادبی دنیا میں کافی بحث و مباحثہ ہوا۔ شبلی نے ''موازنہ انیس و دبیر'' لکھ ڈالی۔ رام بابو سکسینہ اور مسعود حسین رضوی نے بھی ان کے فنی معیار کو پرکھا۔ لیکن سید عبدالباری واضح اور مدلل انداز میں میر انیس کو مرزا دبیر پر فوقیت دیتے ہیں:

''یہ سچ ہے کہ اپنے موضوع کے تقدس اور پاکیزگئ ذوق کی وجہ سے بہت کچھ اپنے ماحول کی رنگینیوں سے محفوظ رہتے ہیں اور ابتذال و رکاکت کی کوئی چھینٹ ان کے دن پر نہیں پڑتی۔''[۲۲]

مجموعی طور پر ڈاکٹر سید عبدالباری نے لکھنوء کے شعر و ادب کے حوالے سے جو نظریہ قائم کیا ہے وہ پیش ہے:

''اس عہد کے ادب پر خرافیات و مافوق الفطری عناصر کا غلبہ نظر آتا ہے نظم و نثر دونوں میں ان کی ہر طرح کارفرمائی ہے۔''[۲۳]

لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس حقیقت کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ جس طرح لکھنوی ادب خیالی و تصوراتی دنیا کی سیر کراتا ہے اس کے ساتھ ہی بہت جلد قاری کو زمین پر لا کھڑا کر دیتا ہے۔

جب دہلی کی رونقیں دوبارہ سے بحال ہونے لگیں تو دہلی سے لکھنوء گئے ہوئے

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

شعراء نے دہلی کا رخ کیا۔ 1857ء کی جنگ نے ہر عام وخاص کو متاثر کیا۔ انگریزی اقتدار میں ثقافتی ومعاشرتی اور تمدنی تغیرات بڑھنے لگے۔ ان حالات وواقعات سے نپٹنے کے لئے نئی منزلوں کی تلاش شروع ہوئی۔ سر سید احمد خان نے مسلمانوں کی زبوں حالی پر غور کیا اور سرگرم عمل رہے۔ ہندوستان میں خاص کر مسلمانوں میں مغربی تہذیب کے تئیں سخت نفرت تھی۔ یہاں تک کہ تہذیب تو دور لوگ زبان کے سایے سے بھی دور بھاگتے تھے۔ ان حالات میں سر سید نے قوم کی تعلیم وتربیت کا بیڑا اُٹھایا لیکن سر سید کے خلاف ناپسندیدگی کا اظہار پرخروش انداز میں کیا جا رہا تھا۔ اس کے باوجود بھی سر سید نے حوصلہ پست نہیں کیا بلکہ ہمت و جذبے کے ساتھ مسلمانوں کی ذہنی بیداری کے لئے فعال رہے۔ ڈاکٹر سید عبدالباری نے آل احمد سرور کی بات کو یہ ثابت کرنے لئے کہ سر سید انگریزوں سے مرعوب نہ تھے بلکہ ان کے تہذیبی سرمائے کے قدرداں تھے بطور ذریعہ اظہار بناتے ہوئے لکھا ہے:

> ''سر سید کی تحریک صرف انگریز پرستی نہیں بلکہ ان کے یہاں ہندوستانیوں کو تہذیب کی دولت سے مالا مال کرنے کا عزم بھی ہے۔ وہ ہمارے شعر ادب کو جدید زندگی کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرتے ہیں اور اردو میں ارضیت، عقلیت اور سماجی شعور کی لے بڑھا دیتے ہیں۔''[۲۴]

سر سید احمد خان، حالی، آزاد اور شبلی نے شانہ بشانہ ہو کر خیالات میں وسعت اور آفاقیت پیدا کر کے اس ناو کو کنارہ لگانے کی ایک کامیاب کوشش کی۔ الغرض سر سید کی ہمہ گیر خدمات کو سراہتے ہوئے ڈاکٹر سید عبدالباری رقمطراز ہیں:

> ''سر سید کی جدوجہد اور کاوش نے اردو زبان وادب کو ایک ایسا مقام عطا کیا جس سے وہ مستقبل میں ہندوستان کے تہذیبی ارتقاء میں ممدو

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

معاون ثابت ہوسکا۔۔۔۔۔۔اس وقت کے رجحانات، احساسات
، تصورات اور کیفیات کے یہ عکاس ہیں۔ انہوں نے نثر کو تصنع و
تکلف کی بندشوں سے آزاد کیا، مقفی و مسجع عبارتوں سے نجات
دلائی۔ سادہ اور شستہ طریقے سے اظہارِ خیال کا اسلوب ایجاد کیا اور
اسے انسانی جذبات کی ترجمانی کے لائق بنایا۔''۲۵

1857ء سے لے کر 1901ء تک کے ادب کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد جب ہم ڈاکٹر سید عبدالباری بیسویں صدی میں داخل ہوتے ہیں تو اردو افسانہ کو سب سے پہلے تنقیدی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اردو افسانے کی پہچان کرواتے ہوئے آپ شمس الرحمان فاروقی سے اتفاق رکھتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''اس کی بنیادی خصوصیت بیانیہ ہے اور یہ کہ افسانہ وقت (Time) کے چوکھٹے میں قید ہوتا ہے اور اس سے کبھی نکل نہیں سکتا یعنی افسانہ وقت کا محکوم ہے اس لئے وہ ہم آپ کی ان پیچیدگیوں اور مجبوریوں کا اظہار کرسکتا جو شاعری کے ہاتھ نہیں لگتیں۔ میرا خیال ہے کہ یہی افسانہ کا نشان امتیاز ہے۔''۲۶

منشی پریم چند کو اردو افسانے کا نقش اول تسلیم کرتے ہوئے زندگی کے سچے ترجمان کا درجہ دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک افسانے میں شامل اجزا میں پلاٹ، واقعات، بیانیہ، کردار اور اس کے اسلوب سے زیادہ اہم اور مرکزی وجود افسانہ نگار کا ہے۔ سید عبدالباری کو اس بات کا بھی افسوس ہے کہ حالی، شبلی اور اقبال نے اس صنف کو اپنی توجہ کو مرکز نہیں بنایا جس کی وجہ سے یہ صنف ثانوی درجے تک محدود ہو کر رہ گئی:

''اگر بڑے قد اور وسیع ذہن و دماغ کے لوگ اس صنف کی طرف
متوجہ ہوتے تو یہ شاعری سے زیادہ معنی خیز رول ادا کرتی۔''۲۷

جب افسانہ رومانی اور ترقی پسند تحریک کے زیر سایہ پروان چڑھ رہا تھا تو یہ ایک

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

ایسا زمانہ تھا جس کے آئینے میں اردو افسانے کی تصویر خراب نظر آتی ہے۔ بقول ڈاکٹر سید عبدالباری ''رومانی افسانہ نگاروں اور ترقی پسندی کے علمبرداروں کا قد نہایت پست تھا۔ وہ نہ زندگی کو پہچانتے تھے اور نہ وقت سے آنکھیں چار کرنے کی اہلیت رکھتے تھے۔'' ترقی پسند افسانہ نگاروں کے سامنے قحط، بھوک اور تقسیم ملک کے المناک موضوعات تھے جن پر خوب لکھا گیا لیکن سید عبدالباری کو شکایت ہے کہ اس دور میں مرد اور عورت کو ننگا کیا گیا اور جنس ان کے لئے ایک خاص موضوع بن گیا تھا۔ خاص طور پر عصمت چغتائی اور سعادت حسین منٹو نے اس موضوع پر زیادہ لکھا۔ سعادت حسن منٹو کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''ظاہر ہے فن کا یہ کمال اور افسانہ کا یہ منصب نہ تھا کہ جزئیات نگاری کے نام پر عورت یا مرد ننگا کر دیا جائے۔۔۔ افسوس کہ انکے فکر و خیال کی دنیا بے حد تنگ تھی۔ انھوں نے اپنے طرز بیان سے انسانی وقار کو اکثر ٹھیس پہنچائی اور تہذیبی اقدار کو پامال کیا۔ وہ انسان کی محرومی مجبوری حیوانیت دیوانگی اور توازن کو بے نقاب تو کرتے ہیں لیکن اس طرح کہ ہمیں خود انسان سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔'' ۲۸

چونکہ ادب میں زندگی پوری طرح بے حجاب ہو کر سامنے نہیں آسکتی اور ادب ہمیشہ نقاب پوشی چاہتا ہے۔ جس کی پاسداری ترقی پسند افسانے میں کم کی گئی۔ شائد اسی لئے ڈاکٹر سید عبدالباری یہ لکھتے ہیں:

> ''غرض ترقی پسند افسانہ نگار حقیقت کے صرف ایک رخ کو پیش کر سکے اور وہ بھی بڑے مکروہ انداز میں۔'' ۲۹

ڈاکٹر سید عبدالباری کی ادبی کاشوں کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد یہ کہنا بے جا نہیں کہ آپ خود شناس، ایک فرض شناس اور غیر جانب دارانہ شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

نے ادب اور ادیب کو تعصب کی نگاہ سے نہیں دیکھا بلکہ ایک مثبت اور تعمیری نقطہ نظر سے ادب کے اہم گوشوں پر بات کی۔ انہوں نے خود اس بات کا اظہار کیا ہے:

''میں نے اردو کے جدید ادیب کو بڑے مشہور ناموں کے حوالے سے پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ آج کل بڑائی اور شہرت کس طرح حاصل کی جاتی ہے اس کی بھی ایک ہولناک داستان ہے۔ میں نے اردو کے جدید ادب کو ہر مکتبہ فکر اور ہر رجحان کے حامل اصحاب قلم کی تحریروں کے ذریعہ خواہ اس کا قد چھوٹا ہو خواہ بڑا، خواہ وہ کسی دانش گاہ میں منصب جلیلہ پر فائز ہو خواہ وہ تلاش معاش میں غبار راہ بن کر مارا مارا پھر رہا ہو، سمجھنے کی کوشش کی ہے۔''[۳۰]

ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کے بعد یعنی 1960ء کے بعد اردو ادب کی ایک ایک جماعت مختلف مسائل و واقعات کو اپنے کے سانچوں میں ڈھالتی رہی ہے۔ ان فنکاروں نے عوام سے گہرا رشتہ قائم کر کے عقلی حجابات کو ہٹا کر اردو ادب کو معیاری فن پارے دیئے۔ ڈاکٹر سید عبدالباری کو ماضی کی ادبی جہاد واقدار سے کچھ تشویش ضرور ہے خاص طور پر اردو افسانے سے لیکن وہ ہم عصر افسانے سے پر امید ہیں:

''اردو افسانہ بھی ماضی کی ٹھوکروں کے بعد اب سنبھلنے کے لائق بن گیا ہے۔ اس کے امکانات روشن ہیں کہ اردو افسانہ کی نئی صبح طلوع ہو اس لئے کہ وقت کی نبض کو پہچاننے کی اس صلاحیت نظر آ رہی ہے اور یہ زود حس اور وقت شناس صنف شاید آنے والے دس سالوں میں انسانی ضمیر کی آواز بن کر اردو کی فائق ترین صنف ادب بن جائے۔''[۳۱]

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

حواشی

1۔ سید عبدالباری، ڈاکٹر: اردو ادب کا تہذیبی تناظر، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس دیلی، 2012، ص 32۔

2۔ ایضاً --------- ص 33، ص 35، ص 40، ص 41، ص 45، ص 46، ص 58، ص 59۔

10۔ سید عبدالباری، ڈاکٹر: لکھنوء کے شعروادب کا معاشرتی وثقافتی پس منظر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ص 316۔

11۔ ایضاً -------- ص 32، ص 376، ص 303۔

14۔ سید عبدالباری، ڈاکٹر: تراوش خیال (مجموعہ مقالات)، ایجوکیشنل پبلیشگ ہاوس دہلی، 2013، ص 50۔

15۔ ابن فرید : چہرہ پس چہرہ، ص 54۔

16۔ سید عبدالباری، ڈاکٹر : لکھنو کے شعروادب کا معاشرتی وثقافتی پس منظر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ص 284۔

17۔ ایضاً ------ : ص 288۔

18۔ شبیہ الحسن نونہروی، پروفیسر: ناسخ، اردو پبلیشرز لکھنوء ص ۲۱۴۔

19۔ عابد علی عابد: تنقیدی مضامین، ہندوستانی پبلیشنگ ہاوس، دہلی۔ ص 65۔

20۔ سید عبدالباری، ڈاکٹر : لکھنو کے شعروادب کا معاشرتی وثقافتی پس منظر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ص 289۔

21۔ عبدالسلام، مولانا: شعرالہند (اول)، دارالمصنفین، عاظم گڑھ ص 216۔

22۔ سید عبدالباری، ڈاکٹر: لکھنو کے شعروادب کا معاشرتی وثقافتی پس منظر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ص 443۔

23۔ ایضاً -------- : ص 294۔

24۔ سید عبدالباری، ڈاکٹر: اردو ادب کا تہذیبی تناظر، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس دیلی، 2012، ص 91۔

25۔ ایضاً---------- : ص 90، 93۔

26۔ سید عبدالباری، ڈاکٹر: نقد نوعیار، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس، دہلی 1991۔ ص 15۔

27۔ ایضاً --------: ص 18، ص 19، ص 20، ص 9، ص 23۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

اختر مدھوپوری ایک قادرالکلام شاعر

حب الوطنی، سماجی مسائل اور ترقی ، جنگ اور امن ، رنگ اور نسل یہ ایسے موضوعات ہیں جن سے ہم سب کا تعلق ضرور رہتا ہے۔ایک ادیب یا شاعر بھی اسی ماحول، تہذیب اور سماج کا فرد ہوتا ہے تو ظاہر سی بات ہے متاثر ہوتا ہے اور پھر اسی سچائی اور حقیقت کو موثر انداز سے پیش کرتا ہے ۔ وہ صرف اپنے جذبات کی ترجمانی ہی نہیں کرتا بلکہ اپنے حسیات اور تخیلات ، امنگوں اور ولولوں اور تجربات زندگی کو بڑی خوبصورتی اور خوش اسلوبی سے بیان کرتا ہے۔اگر شعری روایت میں جھانکے تو ہر سخن گو کی ایک الگ پہچان اور الگ راہ نجات دیکھنے کو ملتی ہے کیونکہ انھیں اس چیز کا بخوبی فہم وادراک اور علم تھا کہ دوسروں کا اتباع کرنے اور دوسروں کے نقش قدم کا پیچھا کرنے پر بھٹکنا پڑتا ہے۔اردوادب وشعر کے ان مسلم الثبوت اصحاب سخن کی اعلیٰ قدروں کی ایک تصویر اختر مدھوپوری ہیں جواُن باقیات الصالحات میں سے ہیں، جنھوں نے اپنی شاعری کی جڑوں کو روایت کی صلح قدروں تک ہی پیوست نہیں رکھا بلکہ غم ذات اور غم کائنات کا سفر طے کرتے ہوئے اپنی شاعری کو عصری جہت بھی عطا کی۔

محمد شہود الحق انصاری نام اختر تخلص تھا ان کی ولادت ۱۸ جنوری ۱۹۲۹ء شہر مدھوپور

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

(بہار) میں ہوئی۔ شاعری کا فطری ذوق عہد بلوغت سے ہی تھا جس کی وجہ وہ سازگار اور ادبی ماحول تھا جوان کی شخصیت اور صلاحیت کی بنیاد بنا۔ بچپن سے ہی شعر کہنے اور مشاعروں میں شرکت کر کے داد و تحسین لینے کا جذبہ خوب تھا۔ میٹرک تک کی تعلم حاصل کرنے کے بعد مرکزی ریلوے میں ملازمت اختیار کر لی اور عہد ملازمت میں متعدد ادبی انجمنوں کے رکن بھی رہے۔ اردو زبان و ادب کے تئیں بے لوث محبت کی بنا پر متعدد لائبریریوں کے جنرل سکریٹری بھی رہے۔ ان کی اردو لگن کا ثبوت مدھوپور ریلوے اسٹیشن کے سائن بورڈ جو انگریزی، ہندی کے علاوہ اردو میں بھی نظر آتے ہیں ان کا کارِنمایاں ہے۔

اپنی دانست کے مطابق اختر مدھوپوری نے شاعری کے میدان میں ہی خامہ فرسائی کی ہے اور ان کی کلیات جس کی ضخامت ۷۸۰ صفحات پر مشتمل ہے، جس میں غزلیں، نظمیں، حمد اور نعت وغیرہ کے علاوہ قرآن کی چند صورتوں کا منظوم ترجمہ بھی شامل ہے۔ اختر مدھوپوری ابتدا میں اپنے اسکول کے اساتذہ کے علاوہ ازیں حضرت نوح ناروی سے اصلاح لیتے رہے لیکن بعد میں علامہ ابراحسینی گنوری سے شرف تلمیذ ہوئے۔ جن کی فن اصلاح سخن پر تین کتابیں ہیں۔ اصلاح الاصلاح، میری اصلاحیں حصہ اول، میری اصلاحیں حصہ دوم، میں اپنے تنقیدی نظریات کو پیش کیا ہے اور اپنے شاگردوں کے کلام پر اصلاحیں دی ہیں۔ اختر مدھوپوری نے گرچہ تمام شعری اصناف میں اپنی جولانی فکر کے جوہر دیکھائے مگر انھیں اپنے فطری رجحان طبع اور اپنی ذہنی مناسبت کی رو سے اردو غزل سے زیادہ جذباتی وابستگی رہی اور اس صنف میں انھوں نے خاص پیش رفت بھی کی۔

اختر مدھوپوری تقریباً کلاسیکی رنگ سخن کے ماحول سے گذرنے کے بعد ترقی پسندی اور پھر ایک نئی منزل پر پہنچ کر شعوری طور جدیدیت کو لبیک کہا ہے اور نئے رنگ و آہنگ میں ایسے ایسے شعر نکالے ہیں جو آج کی جدید ترنسل کے لئے بھی لائق رشک ہو

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

سکتے ہیں۔اپنی خاص شاعرانہ نہج اور شاعرانہ مزاج کی تکمیل و منزل کے بارے میں خود یوں کہا ہے۔

میں عہد نو کا مسافر ہوں میری راہ الگ
کسی کے نقش قدم پر قدم نہیں رکھتا

☆☆☆

جس انجمن میں گیا جس کسی کے پاس گیا
مرا خیال پہن کر نیا لباس گیا

☆☆☆

عصر حاضر نے عطا کی ہے نئی فکر مگر
اب مرا شہر بھی باشندہ نیا مانگے ہے

کسی بھی ادیب یا فنکار کی تخلیقات و تصنیفات کے مربوط و مبسوط مطالعے کے لئے فنکار کی شخصیت سے پوری طرح واقفیت ایک اہم ماخذ اور معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ اس لئے میں نے بھی ان کے شعری سرمایے کو اپنی اہلیت کی بنا پر سمجھنے کے لئے ان کی شخصیت کا مطالعہ کیا، ان کے ادبی ماحول پر نظر دوڑائی، اس دور اور اس عہد کی تحریکات کو جانا تو نتیجہ یہ پایا کہ اختر مدھوپوری کی انفرادیت اور شخصیت کے لئے وہ غیر یقینی ماحول اور غیر محفوظ ماحول معنی خیز اہمیت رکھتا ہے جس میں ان کا بچپن گذرا ہے۔کم عمری میں والد کا سایہ اُٹھ جانا، تنگ دستی، محتاجی اور اپنے بہن بھائیوں کا بوجھ کسی بھی کم عمر کے لئے احساس محرومی کا شکار ہو جانا ایک معمول کی بات ہے۔انہوں نے اپنے احساس محرومی سے ہمیشہ بغاوت کی ہے، بڑے محتاط رہ کر انھوں نے ان مشکلات کو زیر کیا اور کبھی کسی کی محتاجی گوارا نہیں کی۔مثال کے طور پر یہ اشعار دیکھئے۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

آپ بیتی کو کہانی لکھ دیا
آگ کو بھی ہم نے پانی لکھ دیا

دل میں کچھ ایسی تھی کیفیت سوز احساس
جسم گھل جاتا اگر ہم نہیں ہوتے محتاط

دل اگر ٹوٹا اخترؔ تو بہت دور تلک
شور وغل جاتا اگر ہم نہیں ہوتے محتاط

مثل خوشبو میں زمانے میں بکھر جاؤں گا
زندگی میں کوئی کام ایسا بھی کر جاؤں گا

اپنے سر سایہ پسندی کا نہ لوں گا الزام
میں کڑی دھوپ میں صحرا سے گذر جاؤں گا

جسم مر جاتا ہے آواز کبھی مرتی نہیں
میں فقط جسم نہیں ہوں کہ جو مر جاؤں گا

میں ہوں سورج نہ کبھی ڈوبنے والا اخترؔ
رات ہوگی تو ستاروں میں بکھر جاؤں گا

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

ورڈورتھ کا یہ قول کہ " شاعری توانا محسوسات کے قدرتی بہاو کا نام ہے" تو اختر مدھوپوری بھی اس پر اسرار کیفیت کی گرفت میں آجانے کے بعد عالم خودفراموش میں شعر کہتے ہیں۔ زمانہ بلوغت سے ہی پرسوز ماحول تو مقدور تھا ہی پر اس کے علاوہ انھوں نے اپنے عہد کے حالات کا گہرا اثر بھی قبول کیا اور اپنے جذبے وشعور کو کام میں لایا۔ ان کے زمانے میں ملکی اور بین الاقوامی سطحوں پر زندگی، معاشرے اور تہذیب میں کئی گہری تبدیلیاں واقع ہو رہی تھیں۔ ان واقعات نے جہاں بے گناہوں کو اپنا نشانہ بنایا، وہاں دُنیا کے اقتصادی، سیاسی اور سماجی نظام کو بھی درہم برہم کیا۔ ۱۹۲۹ء میں دوسری جنگ عظیم اور ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم، فرقہ وارانہ فسادات، ہجرت اور پھر آزادی، جمہوریت کی بحالی اور اس کے بعد ہندوستان اور پاکستان کے بدلتے ہوئے حالات اس صدی کے اہم واقعات ہیں۔ اب آپ ذرا جگر تھام کے بیٹھیں میں آپ کے لئے انھیں واقعات کے متعلق ان کے دردبھرے اشعار پیش کرتا ہوں۔

غوطہ زنی سے باز نہ آو
جب تک دریا تھاہ نہ لو تم
چاروں جانب آگ لگی ہے
تنہا گھر کی راہ نہ لو تم

گاؤں کو دلہن بنا رکھا تھا موسم نے مگر
آگ گھر گھر میں لگی تو کیا نظارے ڈھونڈتا

لہو لہان سا منظر دکھائی دیتا ہے
یہ عصر نو مجھے محشر دکھائی دیتا ہے

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

ہم سے نیزے پہ کوئی سر نہیں دیکھا جاتا
کربلا سا کوئی منظر نہیں دیکھا جاتا

آدمی سارے کے سارے ہیں لہو کے پیاسے
آج کس ہاتھ میں خنجر نہیں دیکھا جاتا

آگ کا کھیل کوئی اور نہ کھیلے اختر
اب کوئی جلتا ہوا گھر نہیں دیکھا جاتا

سوگ میں ڈوب گیا گھر کا چمکتا ماحول
بچہ یوں سویا کہ پھر وہ نہ اٹھانے سے اُٹھا

سانس بھی لگتی ہے اک قرض سی جسم و جاں پر
ہم نے جس عہد میں جینے کی وسم کھائی ہے

دھرتی لہو لہو تو شفق گوں سماں لگا
ہر کوچہ اپنے شہر کا مقتل نشاں لگا

شہر کا شہر جلا اور اجالا نہ ہوا
سانحہ کیا یہ مقدر کا نرالا نہ ہوا

ہے فقط نام کو آزادی اظہارِ خیال
ورنہ کب کس کے لبوں پر یہاں تالا نہ ہوا

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

باہر ہی رہ گئی نہ کسی گھر میں رہ گئی
اب شانتی کہیں نہ مقدر میں رہ گئی

آتش زنی کہیں تو کہیں خون کا سماں
دہشت سما کے خواب کے پیکر میں رہ گئی

اردو زبان میں قومی ادب کی کمی نہیں ہے بلکہ اس سلسلے میں ہمارے پاس جو سرمایہ موجود ہے بلکہ یوں کہا جائے کہ اردو شاعری کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ اردو شعرا نے ہر دور میں حب وطن کے نغمے گائے ہیں، وطن کی عظمت اور تقدس کو اونچا کیا ہے، بغاوت کے نعرے بلند کیے، سزائیں پائیں، جیلوں میں مشاعرے ہوتے رہے، پبلک پلیٹ فارم سے دھواں دھار نظمیں پڑھی جاتی رہیں۔ وطنیت اور حب وطن بھی اختر مدھو پوری کا پسندیدہ موضوع ہے۔ اس ضمن میں آپ آزاؔد، حاؔلی، چکبسؔت، اقبال، فیض و دیگر محبِّ وطن شعرا کا رنگ دیکھ سکتے ہیں۔ مثلاً ''میرے پیارے وطن''، ''شہدان جنگ آزادی کے نام''، ''بھارت کی تقدیر''، ''عہد اور جہد''، ''قومی یکجہتی''، ''آزادی کی شہزادی''، ''تاریخ'' وغیرہ نظمیں حب وطن اور ہندوستان کی جدو جہد آزادی کی صاف و شفاف تصویریں ہیں۔ ان نظموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اختر مدھو پوری نے اپنے عہد کے حالات و واقعات کو پوری آگہی، خلوص اور دردمندی سے اپنی داخلت میں جذب کیا ہے، اور پھر تخلیقی عمل کے کٹھن مراحل سے گذر کر ان اثرات کو مترنم لفظوں میں ادا کیا ہے۔ وطنیت کے جذبات ان کے خلوص اور ان کی سادگی و اصلیت میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ انھوں نے اپنی نظموں میں حب الوطنی اور عصری حسیت کا اظہار اس طرح کیا ہے:۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

تری آغوش میں گنگ و جمن ہیں چناب و سندھ ستلج موجزن ہیں
برہمپتر اور پدما کے کنارے لہکتے کھیت ہیں شاداب بن ہیں
مہاپن پن کہیں گنڈک کہیں سون کہیں پھلکوں کی موجیں بھی مگن ہیں
کرشنا کاوری کی شوخ لہریں قرار خاطر ارض دکن ہیں
فضا گومتی کا پوچھنا کیا
نشاط زندگی کا پوچھنا کیا

(میرے پیارے وطن)

یوم آزادی بخت ہندوستان تو سرور نظر ، راحت جسم و جاں
تو وہ تاریخ زریں ہے جس کے لئے ہم نے کیا کیا نہیں دی ہیں قربانیاں
ہوں نہ مدھم کبھی تیری تابانیاں
یوم آزادی بخت ہندوستان

(تاریخ زریں)

اے شہدان وطن اے سرفروشان وطن
تم پہ سو سو جان سے قربان ہم اے جان وطن
تم سے باقی صبح آزادی کی ضوافشاں — تم سے تزئین بہار وادی گنگ وجمن
تم سے تجدید فروغ حسن کشمیر و دکن — تم پہ نازاں خوبصورت تاج کا سیمین بدن

(شہدان جنگ آزادی کے نام)

کشمیر سے وابستہ ہے اپنے بھارت کی تقدیر — اک خواب جو ہم نے دیکھا تھا یہ اس کی ہے تعبیر
یہ وقت کی ضوپاشی ہے اپنی قسمت کی تنویر — یہ خلد نما وادی ہے اپنے پرکھوں کی جاگیر

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

ہم ہاتھ میں لیکر اس کو بچانے نکلے ہیں شمشیر
آساں نہیں لے لے کوئی طاقت ہم سے کشمیر

(بھارت کی تقدیر)

اختر مدھوپوری نہ کہ صرف اپنے وطن سے محبت کرتے ہیں بلکہ یہاں کی عوام، یہاں کی معاشرت، یہاں کی تہذیب وتمدن اور یہاں کے آداب واطوار سے محبت کرتے ہیں جس کا ثبوت انھوں نے اپنی شاعری میں دیا ہے۔

ایک کامیاب شاعر کی یہ پہچان ہوتی ہے کہ وہ تمام اپنے منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے دیگر شعری اصناف میں بھی اپنی علمیت اور ہنر مندی کا ثبوت پیش کرے۔ اختر مدھوپوری نے بھی غزل کے علاوہ نظم، رباعی، حمد ونعت اور قطعہ جیسی اصنافِ شاعری میں بھی اپنے جوہر دیکھائے۔

خالق دو جہاں ترے صدقے
سب پہ تو مہرباں ترے صدقے

(حمد)

سارے جہاں کا پیدا کرنے والا تو
رنگ اور نکہت ان میں بھرنے والا تو
ساری خلقت تیری فانی ہے لیکن
میرے خالق کبھی نہ مرنے والا تو

(حمد)

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

محبوب کبریا ہیں ہمارے رسول پاک
کس درجہ خوش ادا ہیں ہمارے رسولِ پاک
اللہ رے یہ شان یہ اعزازِ مقام
سلطان انبیا ہیں ہمارے رسولِ پاک

(نعت)

اے کشورِ ہندوستان پائندہ باد
اے غیرتِ صد باغ جناں زندہ باد

وابستہ ہے تجھ ہی سے ہماری تقدیر
اے مادر ہندوستان تابندہ باد

(رباعی)

مجموعی طور پر یہ کہ اختر مدھو پوری ایک قادرالکلام شاعر، موضوع کی تخلیقی بازیافت، شاعری میں فکر کی ندرت، اظہار میں پختگی، زندگی کے مسائل اور محسوسات کی عکاسی، شاعری میں رکھ رکھاو اور توازن کی کیفیت جیسی خصوصیات کے مالک ہیں۔ لہذا اب میں اپنے اس ناقص اور سطحی مضمون کو ان الفاظ کے ساتھ ختم کرنا چاہتا ہوں کہ میرا یہ مضمون انتہا نہیں بلکہ ابتدا ہے۔ ان آفاقی نظر رکھنے والے ناقدین اور محققین سے اُمید رکھتا ہوں کہ وہ ان کے شعری سرمائے کا مطالعہ کر کے صحیح، مثبت اور مستند مقام کا تعین کریں۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

ہندوستان میں مغلیہ فنِ تعمیر

فنِ تعمیر ایک ایسا آرٹ ہے جس کے پس منظر میں کسی قوم کی نفسیاتی، معاشرتی اور ثقافتی خوبیاں بحسن وخوبی دیکھائی دیتی ہیں۔ ہر عمارت اپنے اندر کوئی نہ کوئی راز رکھتی ہے۔ جب انسان نے اپنی رہائش کے لئے دماغی آنکھوں سے گہرا مشاہدہ کیا تو اپنے بسر اوقات کے لئے خوبصورت عمارتیں تعمیر کیں جن کو آسائش و زبائش، حسن وخوبصورتی سے ہم کنار کیا۔

تاریخ کی ورق گردانی سے یہ حقیقت اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ عہد وسطی کا ہندوستان مختلف تہذیبوں کے میل جول کا زمانہ رہا ہے۔ ترک اور مغل اپنے ساتھ جو تمدنی اور فنی عناصر لے کر آئے تھے، اُس نے ہندوستانی فنون کے تال میل سے تہذیب وتمدن میں ایک جان ڈال دی، بعد میں آگے چل کر جستہ جستہ اپنی ایک شکل اختیار کر گیا جسے دہلی سلطنت میں بھی کافی فروغ حاصل ہوا اور یہی رجحان مغل دور میں بھی جاری وساری رہا۔ انہوں نے اپنے اپنے عہد میں جو پرشکوہ اور خوبصورت عمارتین تعمیر کی ان کے بلند حوصلوں اور شاندار ذوق تعمیر کا پتہ دیتی ہیں۔ لہذا آیئے اب دیکھتے ہیں کہ مغلیہ عہد حکومت کا فنِ تعمیر کیا رہا؟ اس کی کیا خصوصیات رہیں اور کس طرح سے یہ طریقِ تعمیر سرزمین ہند کی حسن و

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

دلکشی، عظمت وشان، رنگارنگی، ملی جلی تہذیب اور مختلف فنون کے ارتقاء میں معاون ہوا۔

مغلوں کے دور سے تاریخ ہند میں ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے جو کئی اعتبار سے معروف ہے۔ اول مسلم سلطنت کا استحکام، دوم علم وفن کی ترقی اور سوم فن تعمیر کے نادر تجربے، بے شمار مساجد اور مقابر اس دور کی زندہ یادگار ہیں اور اپنی روشن خیالی کی وجہ سے تمام کرہ مشرقی میں مشہور رہا ہے۔ اس عہد کی تعمیرات میں ایران، ہندوستان، اور یورپ کے اثرات نمایاں دیکھتے ہیں، بقول KochEbba:

" Mughal architecture creat a supremely confident style by synthesizing the most heterogenous elements. Tranxanian, Tamurdi, Indian, Persian and European. The Supraregional character of Mughal architecture sets it apart from the aerlier islamic architecture of the indian subconitnent and gives it a universial appeal." 1

اس دور میں بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہجہان اور اورنگ زیب جیسے جلیل القدر شہنشاہ ہوئے۔ انہوں نے اپنی انتظامی صلاحتوں کی وجہ سے ملک کو اس قدر مظبوط کردیا کہ دنیا میں ہندوستان کا نام ایک نہایت ہی پرشکوہ سلطنت کے طور پر جانا جانے لگا۔

ظہیرالدین محمد بابر بادشاہ نے جب سلطان ابراہیم لودھی پر فتح پائی تو اس وقت دارالخلافت آگرہ تھا۔ ان کا عہد حکومت کا علاقہ دہلی، آگرہ اور آس پاس کے علاقوں پر مشتمل تھا۔ بابر کی حکومت کا ابتدائی بڑا کٹھن تجس میں تعمیرات کے نمونے کم ملتے ہیں۔ البتہ بابر اور حاکموں نے مسجدیں، باولیاں وغیرہ بنوائیں۔ یہ دور صرف چار سال کے عرصے کو

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

محیط رہا جس میں تعمیرات کے نمونے کم ملتے ہیں۔اس مختصر عہد حکومت میں بھی فن تعمیر میں خاص دلچسپی دکھائی۔ان کے بارے میں جمیل یوسف لکھتے ہیں:

''ساری زندگی جنگ و جدل میں مصروف رہنے کے باوجود بابر علم و
فن کے موتی رولتا رہا۔تیموری خاندان کا
چشم و چراغ ہونے کی وجہ سے اُس کے پیچھے تہذیب وتمدن کی
شاندار روایت تھیں'' ۲؎

بابر موجودہ ہندوستان میں تعمیر شدہ عمارتوں میں گوالیر کے ''مان سنگھ'' اور ''وکرم جیت سنگھ'' کے محلوں سے کافی متاثر تھے۔انہوں نے آگرہ میں ''آرام باغ'' بنوایا۔اس کے بعد پانی پت'' کابلی باغ'' میں ایک مسجد بنوائی۔۱۵۲۷ء میں اتر پردیش کے علاقہ ایودھیا میں ''بابری مسجد'' بنوائی، جس کے اوپر تین گبند، جالی دار کھڑکیاں، صحن، بیچ میں کنواں اور مسجد کو ٹھنڈا رکھنے کے غرض سے اونچا بنایا گیا جو ۱۹۹۲ء میں شہید ہوگئی۔ان کے عہد میں پالم میں ایک مسجد بنوائی گئی۔اس کے علاوہ مسجد ''جمالی اور کمالی'' کی بھی بنیاد رکھی گئی تھی جن کی خصوصیات یہ ہے کہ عربی، فارسی کے علاوہ سنسکرت میں بھی کتبہ لکھا گیا۔

بابر لکھتا ہے کہ ''آگرہ، سیکری، گوالیار، بیانہ دھول پور، اور کول میں روزانہ 1191 سنگتراش میرے کاموں میں مصروف رہتے تھے۔'' آخر کار بابر کا انتقال ۱۵۳۰ء میں آگرہ میں ہوا۔

بابر کی وفات کے بعد سن ۱۵۳۰ء میں نصیر الدین ہمایوں بادشاہ بنا۔لیکن ۱۵۴۰ء میں قنوج میں جنگ کی تو ''شیر شاہ سوری'' کے ہاتھوں شکست کھا گئے۔ان کو اپنے عہد میں تعمیرات کا زیادہ موقع نہیں ملا بہرحال مسجد ''جمالی وکمالی'' جن کی بنیاد بابر کے عہد حکومت میں رکھی گئی تھی ان کے عہد ہی میں پایہ تکمیل کو پہنچی۔اس کے علاوہ ''پرانا قلعہ'' بھی تعمیر کیا

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

جس کی شکل پہلے ہی سے موجود تھی بقول سرسید احمد خان۔

''وہی قلعہ ہے جسکو راجہ انکپال تونور نے اپنے عہد حکومت میں بنایا۔''[۳]

نصیر الدین ہمایوں بادشاہ جب ۱۵۳۰ء میں تخت نشین ہوا تو انہوں نے اس قلعے کو ازسرِنو تعمیر کیا جس کا نام ''دین پناہ'' رکھا۔ اس قلعہ کو چونے اور پتھر سے نہایت مضبوط بنایا گیا ہے جس کی دیواریں روڑی اور سرخ سنگ سے بنی ہوئی ہیں۔ لیکن اب بہت جگہ سے ٹوٹ بکھر گیا ہے۔ اس کے اندر ایک مسجد اور ایک لائبریری باقی ہے، قلعہ میں داخل ہوتے ہی بائیں طرف ایک میوزم کمرا ہے۔ اس قلعے کے تین دروازے بڑے اور چار کھڑکیاں ہیں۔ یہ قلعہ ''شیر گڑھ'' کے نام سے بھی مشہور ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اس قلعے میں بالائی منزل پر ہمایوں کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا، ازان کی آواز سنی تو اچانک چلنے لگا اس کا پیر پھسلا اور گر پڑا، اس قدر چوٹ آئی کہ دوبارہ جاں بر نہ ہوسکا اور سن ۱۵۵۵ء میں انتقال ہوگیا۔

شیر شاہ سوری کا اصلی نام فرید تھا لیکن ۱۵۲۲ء میں ایک لودھی حکمران نے اس کو ''شیر شاہ'' کا لقب دیا، جس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے ایک مرتبہ زندہ تنِ تنہا شیر مار دیا تھا۔ ۱۵۴۰ء میں ہمایوں کو شکست دے کر ہندوستان کے بادشاہ کی حیثیت سے سامنے آیا، یہ ''سرکار'' کے نام سے بھی موسوم کئے جاتے تھے۔ انہوں نے اہم کارنامے انجام دیئے ہیں، جن میں مرشد آباد سے پشاور تک ''گرانٹ ٹرنک روڈ'' کے نام سے بنوائی۔ اس کے علاوہ ''کابلی دروازہ'' بھی ہے اس کو چونے اور پتھر سے خوبصورت بنایا ہے جس کو ''لال دروازہ'' بھی کہا جاتا ہے۔ پرانے قلعے کے اندر جو مسجد ہے اس کے بارے میں مولوی سید ہاشمی یوں رقمطراز ہیں۔

''قلعے کی مرمت ہمایوں نے ۱۵۳۳ء میں کی تھی اور تازہ ترین

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

تحقیقات یہ ہے کہ شیر شاہ نے یہ مسجد ۱۵۴۱ء میں تعمیر کی۔۔۔۔قلعی
آگرہ کو

جب میں نے دیکھا اس کے اندر محل کا ایک حصہ شیر شاہ یا اس کے
بیٹے سلیم شاہ کا بنایا ہوا نظر آتا ہے۔''۴

انہوں نے عمارتیں، تالاب، مسجدیں، اور مقبرے بھی بنوائے جن میں خود ان کا مقبرہ بہار کے سہسرام میں آج بھی فن تعمیر کا بہترین نمونا ہے۔

اسلامی تعلیم کے فروغ کے لئے ایک مدرسہ بھی تعمیر کروایا جس کا تعارف مولانا ابوالحسن علی ندوی نے یوں کروایا ہے:

''مدرسہ و مقبرہ کے تعمیری مصارف ایک لاکھ روپیہ سے زیادہ تھے، یہ
مدرسہ شیر شاہ نے اپنے عہد حکومت سے پہلے دادا کے انتقال، کے
موقعہ پر بطور کارِ خیر بنوایا تھا۔''۵

شیر شاہ سوری کا انتقال بندیل کھنڈ کے لنجر قلعہ کا محاصرہ کرتے وقت ایک حادثہ میں ۱۵۴۵ء میں ہوا۔ ان کا بیٹا سلام شاہ جب تخت نشین ہوا تو اُس نے ''سلیم گڑھ یا نور گڑھ'' میں ایک قلعہ ۱۵۴۵ء میں پانچ برس کی مدت میں چار لاکھ روپے خرچ کر کے بنایا لیکن صرف چار دیواری ہوئی تھی کہ اُس کا بھی انتقال ہو گیا۔ آخر کار دوبارہ ملک کی باگ ڈور ہمایوں بادشاہ کے ہاتھ میں آگئی اور سور حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

جلال الدین محمد اکبر ابھی صرف تیرہ برس کے تھے کہ ۱۵۵۵ء میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ بیرم خان نے گاؤں ''کلانور'' میں اکبر کی تاج پوشی کی اور اکبر شہنشاہ کی صورت میں تخت نشین ہوا۔ ۱۵۵۵ء میں پانی پت کی لڑآئی میں فتح حاصل ہوئی۔ انہوں نے مالوہ، کابل، کشمیر سے بنگال، بہار اور اڑیسہ تک اپنی نصرت کے جھنڈے گاڑ دیئے۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

اکبر کو تاریخ میں اکبر اعظم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور مغل اعظم کی حیثیت سے وہ دُنیا بھر میں مشہور ہیں۔ اکبر کا عہد جو تمام ملک میں امن و خوشحالی کے لئے مشہور تھا۔ فن تعمیر اور علمی ترقیوں کے لئے خاص طور پر موزوں ثابت ہوا۔ ان کے دربار میں ہمیشہ مذہبی بحث و مباحث اور علم و فن کا اہتمام کیا جاتا تھا اور ''آئین اکبری'' جیسی بلند پایہ تصانیف وجود میں آئیں۔ ان کے علم و دانش کے ذوق وشوق میں ہندوستان کا کوئی بادشاہ ان کی ہمسری نہیں کرسکتا۔ اس حوالے سے محمد حسین آزاد لکھتے ہیں:

> ''مشہور کتابوں میں سے شاید ہی کوئی کتاب ہوگی جو اس کے سامنے نہ پڑھی گئی۔ کوئی تاریخی سرگزشت اکثر فقہی مسائل علوم کے عمدہ مباحثے، فلسفہ و حکمت کے نکتے ایسے نہ تھے جن میں وہ خود بحث اور گفتگو نہ کرسکتا۔''[۶]

اس نے اپنے ۴۹ سال کے طویل عہد حکومت میں جو عمارتیں بنائین، ان کا حال لکھنے کے لئے ایک جلد درکار ہے۔ اکبر کی بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے ''صلحِ کُل'' کی پالیسی اختیار کی اور تمام لوگوں کے ساتھ سلوک کیا اور ساتھ ہی ساتھ تمام مذاہب کا بھی احترام کیا، بقول انور علی دہلوی۔

> ''اس نے اپنے دربار میں ہر مذہب کے لوگوں کو جگہ دیا ور انہیں ''نورتن'' کا خطاب دیا تھا۔''[۷]

غالباً تعمیر کا مغل دبستان اکبر سے ہی شروع ہوتا ہے جس نے ایک نئے فن کی بنیاد رکھی۔ پہلی تعمیر ''ہمایوں کا مقبرہ'' ہے جو انہوں اپنے باپ ہمایوں کی قبر پر تعمیر کروایا جس کی تکمیل یقیناً اکبر نے کی۔ لیکن اس کی بنیاد ہمایوں کی بیوہ مریم مکانی (حاجی بیگم) نے رکھی تھی۔ اس مقبرے کا خاکہ ایران کے خاص کاریگر ''میرک مرزا غیاث'' نے تیار کیا تھا۔ یہی

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

وجہ ہے کہ مقبرے میں ایرانی یا فارسی اثر دکھائی دیتا ہے۔ اس مقبرے کی چار دیواری میں آمنے سامنے چار دروازے ہیں اور اس میں سرخ سنگ مرمر کا استعمال زیادہ ہے۔ چاروں طرف باغ سے گھیرا ہوا یہ مقبرا ۲۲ فٹ اونچے پتھر کے چبوترے پر بنا ہوا ہے جس کو ہم ''وفادار بیوی کی محبوبانہ پیش کش'' کہہ سکتے ہیں۔ اسی زمانے میں محمد غوث گوالیاری کا روضہ ''گوالیار میں تعمیر ہوا۔ یہ مرمر کی جالیوں اور نقاشی کے کمالات سے مزین ہے۔ ''آگرہ کا قلعہ'' انہوں نے ۱۵۶۵ء میں خاص کاریگر ''قاسم خان'' کی دیکھ ریکھ میں ۵ سال کی مدت میں ۳۵ لاکھ روپئے کے خرچ سے جمنا کے کنارے یہ تعمیر کیا۔ اس کی محرابوں پر اکبر نے قرآن کی آیتوں کی جگہ جانوروں، پرندوں اور پھول پتیوں کو منقش کروایا ہے، ۷۰ فٹ اونچے تراشے گئے لال پتھر سے بنے قلعے کی دیواروں میں کہیں بھی ایک بھی بال گھسنے کی جگہ نہیں ہے۔ قلعے کے مغرب میں 1566ء میں دلی دروزے کی بنیاد ڈالی گئی۔ دوسرا دروازہ ''امر سنگھ'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ فتح پور سیکری اکبر کی تعمیری مصروفیتوں کا مرکز رہا ہے۔ فتح پور سیکری کی مسجد ہندوستان بھر میں اپنی نظیر نہیں رکھتی اس کا طول 544 فٹ اور عرض 474 فٹ ہے۔ مسجد کا جنوبی دروازہ ''بلند دروازہ'' کہلاتا ہے۔ ''جہانگیر محل'' اکبر کا اہم کارنامہ ہے۔ یہ محل ۲۴۹ فٹ لمبا اور ۲۶۰ فٹ چوڑا ہے۔ محل کے چاروں کونوں میں چار بڑی چھتریاں ہیں۔ اندر جانے کا دروازہ نوکدار ہے۔ محل کے بیچ میں ۷۰ فٹ کا آنگن ہے۔ محل کے سامنے لان میں پیالے کی شکل کا ایک خصوصی حوض بنا ہوا ہے جس پر فارسی کی تحریریں ملتی ہیں دھنی اور اکبر محل بھی بنایا گیا ہے۔

اکبر نے سلیم کے پیدا ہونے کے بعد ۱۵۷۵ء میں ''شیخ چشتی'' کی شان میں فتح پور سیکری بنانے کا حکم دیا۔ ۱۵۷۵ء میں اکبر نے گجرات فتح کرنے کے موقع پر بطور یادگار کے فتح پور سیکری کو آباد کیا جسے ۱۵۷۵ء میں مغل سلطنت کی راجدھانی بنایا گیا۔ جس کا پھیلاؤ

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

۷ میل لمبے پہاڑی علاقے تک پھیلا ہوا ہے۔اس کے ۹ دروازوں میں آگرہ، دلی، اجمیر، گولیار، ہیں۔''دیوان عام'' میں منصف داروں اور ان کے نوکروں کے لئے محرابی برآمدے بنے ہیں۔دیوان عام میں اکبر اپنے منتریوں سے صلاحے مشورہ کرتے تھے بقول سرسید احمد خان:

''یہ مکان بھی بہت نامی ہے اور بہت خوشنما بنا ہوا ہے۔''[8]

اکبر کی فن تعمیر سے دلچسپی کا یہ ثبوت ہے کہ اُس نے تمام ممالک سے فنکار جمع کر لئے تھے اور ان کے عہد میں تعمیرات کی بھرمار تھی، جن میں عرب سرا، خیر المنازل، بھول بھلیاں، دیوان خاص، پنج محل، وغیرہ وغیرہ ہیں پنج محل کی کی نظافت کی دلکشی ملاحظہ کیجیئے۔ بقول مولوی سید ہاشمی صاحب۔

''سب سے بڑھ کر خوبصورت اور اس کے خاص طرز کی سب سے ممتاز یادگار تین چھوٹی چھوٹی حویلیاں ہیں۔''[9]

یہ تین حویلیاں ''بیربل کی بیٹی کا محل''، ''ملکہ مریم مکانی کا مکان''، ''سلطانہ رقیہ بیگم کا مکان'' کے نام سے منسوب ہیں جو کہ انہوں نے تین محبوب بیگموں کی خوشی اور سکونت کے لئے تعمیر کی تھیں۔جن پر تمام سونے کا پانی پھیرا ہوا تھا۔''چالیس ستون عمارت'' جس کے نیچے کی منزل میں اندر کی گو میں اور گرد کے بیرونی والان میں ۴۲ ستونوں کی قطاریں تھیں۔مختصر یوں کہ اکبر کے عہد کے فن تعمیر میں کے بارے میں یوں کہا گیا ہے۔

''اس میں صفوی اور راجپوتی طرز کی آمیزش ہوئی جس میں قیمتی پتھر کا استعمال کیا، فنی آرائش اور جمالیاتی اعتبار سے گوناگوں اور ممتاز صفت ہے۔''[10]

جہانگیر کا پورا نام نورالدین محمد جہانگیر ہے اُس نے اپنے پائے تخت کے لئے

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

لاہور شہر کو منتخب کیا۔ اس عہد میں بہت کم تعمیرات کا کام ہوا جس کی وجہ یہ تھی کہ جہانگیر کو مصوری اور باغات میں دلچسپی تھی۔ البتہ "جہانگیر محل"، "شالامار باغ" جو کشمیر میں موجود ہے، لاہور میں "انارکلی" کا مقبرہ، آگرے میں "اعتمادالدولہ" کا مقبرہ۔

یہ مقبرہ دریا کے بائین کنارے ایک باغ کے وسط میں بنا ہوا ہے جس کی چار دیوری ۴۵۰ فٹ ہے، اور دو منزلیں ہیں۔ یہ عمارت ایک چبوترے پر بنوائی گئی ہے۔ اس دور کے فن تعمیر کی خصوصیات یہ ہیں کہ جہانگیر نے اُن تمام بوسیدہ عمارتوں، مکاتب اور مدرسوں کی مرمت از سرنو کرائی جو دو تین دہائیوں سے پرندوں اور جانوروں کا مسکن بنے ہوئے تھے۔ جہانگیر کے بارے میں شری رام شرما نے اپنی کتاب The religious policy of the Mughal Emperors. میں جو لکھا ہے ملاحظہ کریں:

" Jahangir personal shortcoming might have been, he was, to a majority of his subjects, a good muslim. only a muslim could have desecrated to temple, at pushkar and in mewar, upheld the true law by preventing the conversion of qutub and his companion of hinduism, stoped the conversion of muslim girls by marriage to hindus in Rajawi, orderd a simple translation of the quran and supported the whole structure of a muslim state." 11

شاہجہان شہاب الدین خرم ۱۶۲۸ء میں تخت نشین ہوا لیکن آخری عمر میں ان کا بیٹا اورنگ زیب ان پر حاوی ہوگیا۔ شاہ جہان کو قید کر کے ۱۶۵۸ء میں بادشاہ بن بیٹھا۔ شاہجہان کا شوق تعمیر حیرت انگیز ہے کہ اس کے عہد میں مغل اسلوب تعمیر میں نمایاں انقلاب

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

آ گیا۔ خصوصیات یہ ہیں کہ انہوں نے سنگ سرخ، سنگ مرمر اور قیمتی پتھروں کا استعمال کیا۔ کہا جاتا ہے کہ مغلیہ فن تعمیر کا عروج ان کے عہد حکومت میں ہوتا ہے۔ سید معین الحق اس طرح رقمطراز ہیں:

''شاہجہان کی عمارتیں تو دنیا کی بہترین تعمیرات میں شامل ہیں ہی، لیکن باقی پانچ بادشاہوں میں ایسا کوئی نہ تھا جس نے کوئی نہ کوئی قابلِ ذکر عمارت نہ بنوائی ہو'' ۱۲

۱۶۵۴ء میں شاہ جہان نے آگرہ میں موتی مسجد بنوائی۔ اس مسجد کی گنبد بہت خوبصورت ہے۔ سفید سنگ مرمر سے بنی اس عمارت کی لمبائی ۲۳۷ فٹ اور چوڑائی ۱۰ فٹ ہے۔ پارسی براؤن نے اسے مغل طرز تعمیر کی اہم مقبول تعمیر قرار دیا ہے۔ حرم سرایہ سفید سنگ سے بنی چاردیواری ہے جس کا صحن لمبا چوڑا نہیں ہے صرف ۷۰ اور ۲۳۰ فٹ ہے۔ اس کے تین رخ میں بیگمات کے مکانات ہیں لیکن موجودہ حالت میں کوئی تعمیری حسن نہیں رکھتے۔ اس کی خصوصیات اس کے حمام سے ہے جو صحن کے ایک جانب بنا ہے۔ خاص محل، شیش محل، نگینا مسجد، انگوری باغ، نہر بہشت وغیرہ کے علاوہ جامع مسجد آگرہ جس کی تعمیر شاہجہاں کی بیٹی ''جہاں آرا بیگم'' نے ۱۶۸۴ء میں کروائی تھی۔ مسجد ۳۰ فٹ لمبی ہے اور ۵ فٹ چوڑی ہے اس کو لکڑی اور اینٹ کی مدد سے بنوایا گیا تھا اور یہ مسجد'' جہان نامہ'' کے نام سے بھی جانی جاتی ہے۔

شاہجہان بادشاہ کی سب سے مشفق بیگم ارجمند بیگم عرف ''ممتاز محل'' کے اچانک انتقال سے بادشاہ کو صدمہ پہنچا۔ آگرہ کے قلعے سے ڈیڑھ کلومیٹر دور جمنا ندی کے دائیں کنارے پر یہ مقبرہ تین سو سال سے دو محبت کرنے والوں کی داستان سنا رہا ہے۔ اس مقبرے کے استاد'' احمد لاہوری'' تھے۔ عالمی یافتہ عمارت کی خصوصیت دریائے جمنا کے

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

کنارے تاج محل مغل دور کی بنی ہوئی عمارتوں سے الگ ہے۔ یہ کسی باغ کے بیچ نہیں بنائی گئی بلکہ ندی کے ایک دم کنارے اور آمنے سامنے ایک سنگِ سرخ سے مسجد اور مہمان خانہ بنایا گیا ہے۔ مرکزی پیشانی پر کندہ قرآنی آیات، فنِ خطاطی کا ایک زبردست نمونہ پیش کرتی ہیں۔ ایک طرف ممتاز محل اور دوسری طرف شاہجہان کی قبریں اس قدر دیدہ زیب ہیں کہ سیر کرنے والوں کو دعوتِ نظارہ دے رہی ہیں۔ اس کی اہمیت کا تعین مولوی ہاشمی صاحب کے اس قول سے کیا جاسکتا ہے:

''ہندوستان کی کسی عبادت کے اتنے نقشے اور تصویریں نہیں کھنچی ہونگی، جتنی اس کی اور نہ کسی کی تفصیلی کیفیت اتنے بار قلم بند ہوئی ہوگی۔'' [۱۳]

لہذا ہم اس کی تعریف یوں کردیں تو غلط نہ ہوگا کہ:

اک شہنشاہ نے بنا کے حسیں تاج محل
ساری دنیا کو محبت کی نشانی دے دی

دہلی کی جامع مسجد اور لال قلعہ دنیا بھر کے شاہی محلوں میں نظیر نہیں رکھتا۔ جامع مسجد کا نقشہ موتی مسجد کے نقشے سے مشابہ ہے لیکن اس کا پیمانہ بڑا ہے۔ اسے بلند کرسی پر تعمیر کیا ہے جو مغلیہ دور کی خاص خصوصیت تھی۔ اس کے تین بڑے دروازے، عالیشان گنبد بنائے ہیں۔ دو کونوں پر دو مینار ۳۰ فٹ بلند ہیں۔ اس کا آنگن ۳۲۵ فٹ میں پھیلا ہوا ہے اس میں شاہجہانی طرز میں پھولدار محرابیں بنی ہیں۔ علامہ اقبال نے جامع مسجد کے متعلق کہا تھا کہ یہ عمارتوں میں ''بیگم'' معلوم ہوتی ہے۔

شاہجہان نے مشہور دلی کا لال قلعہ تعمیر کیا جو آگرے کے قلعے کی شکل متوازی میں بنایا گیا ہے تقریباً ایک کروڑ کی لاگت سے بنا یہ قلعہ ''حمید اور احمد'' نام کے کاریگروں کی دیکھ

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

ریکھ میں پچھمی دروازے کا نام ''لاہوری'' اور دکنی کا ''دلی دروازہ'' ہے۔ یہ قلعہ ۳۰۰ فٹ لمبا اور ۵۰ فٹ چوڑا ہے۔ اس کے عقب میں ایک ''صحن باغ'' اور مشرق کی جانب '' رنگ محل'' (ج) بنا ہوا تھا جس میں حمام وغیرہ اور دوسرے کمرے تھے اس کی چھت کے گرد یہ مشہور کتبہ کندہ تھا۔

اگر فردوس بروئے زمین است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

اس قلعے کی عمارتوں میں صرف چار یعنی ''نوبت خانہ، دیوان عام، دیوان خاص ،رنگ محل'' باقی رہ گئے ہیں۔ ہندوستان کے اس انجیر بادشاہ کے زوال کا عالم یہ ہے کہ شاہجہان بادشاہ آگرہ کے قلعہ میں قید تھا اور اس کا باغی بیٹا اورنگ زیب ہندوستان کی بادشاہت کا علان کرر ہا تھا۔ ان کا انتقال ۱۶۶۶ء میں ہوا۔

محی الدین اورنگ زیب عالمگیر کے چھٹے بادشاہ ۱۶۵۸ء سے ۱۷۰۷ء تک رہے تھے۔ ان کے عہد میں فن تعمیر کی طرف زیادہ دھیان نہیں دیا گیا کیونکہ انہیں فن تعمیر میں کم دلچسپی تھی۔ البتہ انہوں نے ''مسجد شاہی'' بنوائی اس کے بعد لاہور میں'' بادشاہی مسجد'' بنوائی۔ اپنی عزیز بیوی ''رابعہ رورانی'' کی یاد میں ایک مقبرہ بنایا جو ''بیوی مقبرہ'' کے نام سے مشہور ہوا۔ انہوں نے لال قلعہ دہلی کے اندر ''موتی مسجد'' تعمیر کی۔ اورنگ زیب اپنے باپ دادا کی بنائی ہوئی حکومت کو قائم نہ رکھ سکا۔ اسی طرح آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے ساتھ ہی ۱۸۵۸ء میں مغل دور کا اختتام ہو جاتا ہے اور انگریز سامراج ملک پر قابض ہو جاتے ہیں۔

اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ جب پوری دنیا اس فن سے بے بہرہ تھی تو مصر، یونان اور ہندوستان نے اپنی تہذیبی شناخت کے ساتھ دنیا کو بیدار کیا، انہوں نے آہستہ آہستہ زمین کھرچی اور راستے ہموار ہو گئے۔ ہندوستان میں عرب، یونان، مصر ایران اور یورپ

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

کے لوگوں نے پیش قدمی کی۔

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ دہلی سلطنت کے دوران ہی فن تعمیر میں آمیزش اور تال میل شروع ہو گیا تھا۔ مغل دور میں یہ سلسلہ اور آگے بڑھا۔ ترک، ایرانی اور ہندوستانی فن تعمیر کی آمیزش سے بنا یہ طرز مغل دور میں عروج کو پہنچا۔ مغل دور میں فن تعمیر کے نئے نئے تجربے بھی ہوئے جس سے دہلی سلطنت کے مقابلے اس کی اپنی الگ پہچان بن گئی۔ مغل تعمیرات کو دیکھ کر ایک ایسے ہندوستان کا تصور اُبھرتا ہے جو مشترکہ تہذیب کی علامت ہے اور یہاں ہزاروں کی تعداد میں ایسی عمارتیں موجود ہیں جو مختلف مذاہب، مختلف تہذیبوں اور مختلف روایات کا سنگم ہیں۔ مغل عمارتوں کی فن تعمیرات کی نمایاں خصوصیات ایران کی طرز کے گنبد ہیں جو پیاز نما اور گردن پر سمٹے ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ میناروں پر قائم چھتریاں، دربار کے عالیشان ہال، عظیم الشان دروازے، باغوں کے بیچوں بیچ مقبروں کی تعمیر کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ اس عہد کی عمارتین کئی مذاہب کی تہذیب ہیں۔ یہ عمارتیں دیکھنے میں نازک اور سبک لگتی ہیں جبکہ دہلی سلطنت کی عمارتیں بھاری بھرکم لگتی تھیں۔ مغلوں نے ہندوستانی طرز تعمیر اور :ندوستانی علامتوں کی زیادہ آمیزش کی جیسے کے آرائش میں گھنٹوں، مٹکوں، کنول، بیل بوٹوں سے سجے ستون، چھجے اور چھتریاں وغیرہ، شیشے اور قیمتی پتھروں کی جڑاو نقاشی وغیرہ۔ اس طرح سے مغل دور میں ایرانی، ترکی طرز اور ہندوستان طرز کی آمیزش کا سلسلہ جاری رہا اور اسے عروج بھی حاصل ہوا۔ اور اکبر کے زمانے میں مغل تعمیر میں استحکام پیدا ہوا اور ہر زمانے میں انکی کچھ نہ کچھ خصوصیات رہیں۔ لیکن شاہجہان کے زمانے میں فن تعمیر اپنے عروج تک پہنچ چکا تھا اور پھر بعد میں جا کر اورنگ زیب کے زمانے میں جمود کا شکار ہو جاتا ہے۔ بالآخر یہ کہوں گا کہ مغل ایرانی فنون کے وارث تھے اور سلطنت مغلیہ میں ہندوستان کا فن تعمیر کمال کو پہنچا اور آج تک ہندوستان کے لئے بڑا ذریعہ اقتصادیات رہا ہے۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

اہم ماخذات

1۔ خان، سرسید احمد : آثارلصنادید، مطبوعہ، اردو کادمی دہلی ۲۰۰۰ء

2۔ سید اسد اللہ، ڈاکٹر: ہندی ادب کے بھگتی کال پر مسلم ثقافت کے اثرات، مطبوعہ ترقی اردو بیورو نئی دہلی۔

3۔ صدیقی، احمد عتیق: ہندوستان کی تہذیب وثقافت اور فنون لطیفہ، مطبوعہ، نیشنل میوزم نئی دہلی ۱۹۹۳ء

4۔ سید ہاشمی صاحب فرید آبادی، مولوی: اسلامی فن تعمیر، ہندوستان میں، مطبوعہ، دارالطبع جامعہ عثمانیہ۔

5۔ نورالدین جہانگیر بادشاہ: تزک جہانگیری، لاہور، مترجم مولوی احمد علی رام پوری، سنگ پبلی کیشنز ۱۹۸۷ء۔

6۔ تاراچند: تمدن ہند پر اسلامی اثرات، ۱۹۶۴ء۔

7۔ افتخار احمد غوری، ڈاکٹر: سلطان دہلی کے دور کی انتظامی اور سیاسی تاریخ، ۱۹۸۹ء ۔

8۔ معین الحق سید، ڈاکٹر: اسلامی عہد میں فن تعمیر۔

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri



لیاقت علی جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں ایک ہونہار ریسرچ اسکالر ہیں ۔ ہمیشہ علمی اور ادبی سرگرمیوں میں مصروف رہتے ہیں ،سینٹر کے ادبی پروگراموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں ۔ ایم فل میں آنے کے بعد سے ہی انھوں نے اپنی ادبی لیاقت کو ثابت کرنے کی کامیاب کوششیں کی ہیں ۔ ہندوستان اور بیرون ملک کے رسالوں میں ان کے مضامین ، تبصرے اور دیگر تحریریں شائع ہوتی رہتی ہیں ۔ اپنے طالب علموں کو ادبی میدان میں سرگرم دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کیونکہ اردو کا مستقبل ایسے ہی طالب علموں سے تابناک نظر آتا ہے۔

''ارتکاز نظر'' ان کے مختلف مضامین کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً انھوں نے رسالوں کے لیے لکھے یا کسی سیمنار میں پیش کیا۔ اکیسویں صدی کا طالب علم کس طرح ادب کو دیکھتا اور سمجھتا ہے، اس کی یہ ایک خوبصورت مثال ہے۔ ریسرچ اسکالرز عموماً دوران تحقیق اپنے موضوع کے اردگرد ہی رہتے ہیں لیکن لیاقت علی کی کتاب ''ارتکاز نظر'' میں شامل مضامین یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ اپنے تحقیقی حصار میں مقید نہیں رہے۔ مضامین کے عناوین سے ہی ان کے ادبی ذوق وشوق کا اندازہ ہوتا ہے۔ سائنٹفک تحقیق کے مسائل، لسانیات اور پھر جموں وکشمیر میں اردو ادب سے متعلق فکرمند نظر آتے ہیں۔ اس کتاب میں شامل مضامین کی نوعیت بلاشبہ طالب علمانہ ہے، تحریر میں مقامی اثرات کے رنگ بھی موجود ہیں لیکن مافی الضمیر کی ادائیگی کا حسن بھی موجود ہے۔ میں اس کتاب کی اشاعت کے لیے انھیں مبارک باد پیش کرتا ہوں اور روشن مستقبل کی دعائیں بھی دیتا ہوں۔

پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین

ہندستانی زبانوں کا مرکز جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

M. R. Publications

Printers, Publishers, Suppliers & Distributors of Literary Books

10 Metropole Market, 2724-25 First Floor
Kucha Chelan, Daryaganj, New Delhi-110002
Cell: 09810784549, 09873156910 E-mail: abdus26@hotmail.com

ISBN 93-8

CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri